DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۱۸۸

متمنّی ہے رستی خود داری ہی یہ وہ توپیں اثر ہو کامل تجدید ہے جن کا نظامِ زندگی۔

گورنمنٹ نارمل سکول کرنال کا ماہوار رسالہ

بظلِّ حمایت

عالیجناب رانا عبدالحمید خانصاحب ایم۔ اے پی۔ ای ایس

انسپکٹر مدارس انبالہ ڈویژن

تجدیدِ تعلیم

کرنال

مدیر مسئول

مدیر اعزازی

پنڈت گوپال کرشن ایم۔ اے

(حافظ) محمد رضوان اللہ

فاضلِ ادب، مولوی فاضل۔

ادیب فاضل

مینجر

مولوی محمد منیر

(منشی فاضل)

جلد ۳

نمبر ۶

قیمت فی پرچہ

چھ آنہ

بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء

سالانہ چندہ

للعہ (تین روپے)

منظور کردہ صاحب ڈائرکٹر بہادر تعلیمات پنجاب بروئے چٹھی نمبر ۲۰۶۲۳/ع مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ سنہ عیسوی

قواعد تجدید التعلیم

۱۔ پرچہ ہر ماہ ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر پرچہ نہ پہنچے تو تاریخ اشاعت سے دس روز کے اندر اطلاع دینے پر دوسرا پرچہ مفت بھیجدیا جائیگا۔ بعد میں مانگیں تو چھ آنہ قیمت لی جائے گی۔

۲۔ صرف اُن جواب طلب خطوط کا جواب دیا جائیگا جن کے ساتھ جوابی کارڈ یا سوا آنہ کا ٹکٹ ہوگا

۳۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت بنام "ہیڈ ماسٹر نارمل سکول کرنال" کی جائے۔ اور ہر دفعہ لکھنے پر اپنا پورا پتہ لکھیں۔ نیز منی آرڈر کے کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر کریں۔

۴۔ کوئی فرقہ دارانہ، سیاسی۔ یا دلآزار مضمون ہرگز شائع نہ ہوگا۔

۵۔ تمام مضمون نگار اپنے مضمون مختصر اور صاف لکھ کر سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑ کر اور کاغذ کے ایک طرف تحریر کرکے بھیجا کریں۔ مضمون لکھتے وقت فضول عبارت آرائی سے پرہیز کیا جائے۔ صرف دلچسپ اور مفید مضامین شائع ہو سکیں گے۔

۶۔ نظموں کے بھیجنے میں خاص احتیاط سے کام لیں جب تک نظم فن کے لحاظ سے درست بندش کے لحاظ سے چست اور مضمون کے لحاظ سے مفید نہ ہوگی۔ اُس وقت تک ہرگز شائع نہ ہو سکیگی۔

۷۔ رسالہ کی قیمت تین روپے سالانہ اور ضخامت ۴۸ صفحہ ماہوار ہے۔ تعلیم بالغان کے ۱۲ صفحے کے ضمیمہ کی قیمت جو ماہوار نکلتا ہے۔ ایک روپیہ سالانہ علیحدہ ہے۔

گوپال کرشن ہیڈ ماسٹر

پنڈت گوپال کرشن ایم اے نے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس نمبر ۱ ایبٹ روڈ لاہور میں چھپوا کر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال سے شائع کیا

فہرست مضامین تجدید التعلیم

بابت

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

شذرات

بقوائے ع قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ اشاعت ہذا سے ادارت کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں مجھ جیسی بے بضاعت اور ہیچ میرز ہستی کے نحیف و ناتواں شانوں پر ڈال دیا گیا ہے. جس کی نہ مجھ میں صلاحیت اور نہ قابلیت بلکہ میری مثال اس مسافر کی طرح ہے. کہ جس کو طویل اور کٹھن سفر درپیش ہو لیکن وہ راہ و رسم منزل سے قطعاً بیگانہ و ناآشنا ہو. اور قدم قدم پہ لغزش کا ڈر ہو۔ اشاعتِ گذشتہ میں جو تعریفی کلمات میرے لئے استعمال کئے گئے ہیں. وہ حقیقت میں مدیرِ سابق جیسے کہنہ مشق اور تجربہ کار ہی کو زیب دیتے ہیں. مجھ جیسے ناآموز کیلئے جو میدانِ صحافت میں مُبتدی کی حیثیت رکھتا ہو. ان الفاظ کا استعمال کسی صورت میں اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

بہرحال اگر ہمارے محترم سرپرست کی رہبری، رفقائے کار کی اعانت اور رب العزت کا فضل شامل حال رہا۔ تو ممکن ہے یہ مشکل آسان ہوسکے. وما توفیقی الا باللہ

۲۔ "مقامی میلہ بیکھا" کے موقعہ پر ہمارے سکول کے سکاؤٹس نے زیر سرکردگی راؤ منصور علیخاں صاحب و چودھری دھوبن سنگھ صاحب مجمع کو قابو میں رکھنے اور میلے کے انتظام میں منتظمین کا جس خوش اسلوبی اور جانکاہی کے ساتھ ہاتھ بٹایا ہے۔ اُس کا اندازہ ناظرین کو میلے کے کرتا دھرتا اور روحِ رواں نواب زادہ ممتاز علیخاں صاحب کی اس چٹھی سے ہوگا. جس کو ہم زیرِ نظر اشاعت میں شائع کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبائے نارمل سکول نے کشتی میں

جو انعامات حاصل کئے ہیں۔ اُن سے اُن کی ورزش اور صحتِ جسمانی کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کیلئے نارمل سکول کرنال میں خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے۔

۳۔ اولمپک ٹورنمنٹ کے سلسلہ میں نارمل سکول کرنال نے مختلف کھیلوں میں متعدد انعامات حاصل کئے ہیں۔ کبڈی کا مقابلہ امسال جونڈلہ کی مشہور و معروف ٹیم سے ہوا (جو مسلسل تین سال سے کامیابی حاصل کر رہی تھی) کھیل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسی زبردست ٹیم کے مقابلہ میں کامیابی بڑی مشکل اور کٹھن تھی۔ جو کہ صرف ہمارے سکول کے حصے میں آئی۔ تقسیم انعامات کے موقعہ پر ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال نے جو تعریفی کلمات ہماری ٹیموں کے لئے استعمال فرمائے اس کیلئے ہم جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اور چودھری دھوپن سنگھ صاحب پی۔ ٹی۔ آئی کی خدمت میں تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

۴۔ ڈسٹرکٹ ٹورنمنٹ میں مختلف کھیلوں میں ہمارے مقامی گورنمنٹ ہائی سکول نے متعدد انعامات حاصل کئے ہیں۔ انعامات حاصل کرنے والے طلبار کو نیز جناب چودھری لعل دین صاحب بی۔ اے۔ ایس ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں اس غیر معمولی اور شاندار کامیابی پر ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ جو ٹیمیں امسال ٹورنمنٹ میں ناکام رہی ہیں اُن سے بھی ہمیں پوری ہمدردی ہے۔ اُن کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے اور اپنے پیشِ نظر چیونٹی اور تیمور کی مشہور مثال رکھنی چاہیئے۔ اگر اُن کی مسلسل کوشش جاری رہی تو انشاء اللہ اگلے سال کامیابی اُن کے قدم لے گی۔

۵۔ ہم اپنے محترم ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں اُن کے فرزند ارجمند ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب کی شادی خانہ آبادی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ خدائے برتر اس تقریب سعید کو دولہا دلہن نیز دیگر اعزہ کیلئے مبارک و میمون ثابت کرے اور وہ ہمیشہ شادکام اور بآرام رہیں ع

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

۶۔ نارمل سکول کرنال کے بیشتر ممبران سٹاف زیر ہدایت ونگرانی جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ایک ڈرامے کی تیاری میں غیر معمولی طور پر منہمک ہیں۔ جس کی کل آمدنی "وار فنڈ" میں دی جائیگی۔ یہ ڈرامہ قریبی فرصت میں حسب تجویز ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کرنال سٹیج کیا جائے گا۔ جس کی مفصل روئیداد آئندہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کی جائیگی۔

الغرض ہمارا اسکول ہر تحریک اور زندگی کی ہر دوڑ دھوپ میں پیش پیش ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ نارمل سکول سوشل اخلاقی اور امداد باہمی کی تحریکوں کا مرکز وگہوارہ ہے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ خدائے برتر ہمیں ملک و قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

۷۔ آخیر میں ہم اپنے نئے مضمون نگاروں (خصوصاً رفیق محترم چودھری غلام رشید خاں صاحب صدر قرضہ بورڈ کرنال۔ مولانا راغب حسن صاحب ناظم مسلم لائبریری کرنال، حکیم نور احمد صاحب گلچیں سابق مدیر "آفتاب مشرق" وغیرہ) کا بیش از بیش زریں الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے ہماری درخواست پر اپنے مضامین ارسال فرمائے۔ اُمید ہے۔ کہ آئندہ بھی آن کی نظر عنایت ہمارے محبوب رسالے پر ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔ اور وہ ہمیں ممنونیت کا موقعہ دیتے رہیں گے۔

(مدیر اعزازی)

وہ میرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہے امیر
پیشِ خالق اِدّعائے بے گناہی کیا کروں

حیاتیات

(رشحات قلم پروفیسر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم)

ترقی کی اُمنگوں سے پر پرواز پیدا کر
وگرنہ چھو نہیں سکتا تو ہرگز بام شہرت کو

مرے شہپر کے سائے میں ہے سارا عالم امکاں
اگر دیکھوں ذرا پھیلا کے میں بازوئے ہمت کو

طوفانِ حوادث سے لڑ سینہ سپر ہو کر
آتی ہیں یہ آوازیں پیہم لبِ دریا سے

چٹکنا بھی تجھے مشکل ہے غنچے کی طرح غافل
گلستاں کی فضا لبریز ہے شورِ عنادل سے

ہر ایک سطرِ نفس میں غافل ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھولکر دیکھی یہ زندگی کی کتاب تو نے!

ایک دانہ بھی مرے خرمن کا جل سکتا نہ تھا
صاعقے بربادیوں کے تلملا کر رہ گئے

رزمگاہِ زندگی کرتی تھی مردوں کو تلاش
ہمتیں کچی تھی جنکی ہچکچا کر رہ گئے

عقلِ انسانی نہ سمجھی آج تک رمزِ حیات
عالمِ فطرت کے جلوے مسکرا کر رہ گئے

(نوٹ) زیر ترتیب اشاعت میں کسی دوسری جگہ مولانا مرحوم کی سوانح حیات بھی شائع کی جا رہی ہے (ادارہ)

مولانا وحید الدین سلیمؒ

(از جناب حکیم نور احمد صاحب گلچین کرنال)

میرے وطنِ قدیم پانی پت میں حضرت حالیؔ مرحوم کے بعد پروفیسر مولانا وحید الدین سلیمؒ دوسرے بزرگ ہوئے ہیں۔ جن پر اس مُبارک شہر کے ادب و شعر کا خاتمہ ہو گیا۔ اربابِ فضل و کمال اب بھی وہاں موجود سہی۔ مگر وہ یگانۂ روزگار جامعیت کہاں۔ جو اس مقدس بزرگ کی ذات مستجمع الصفات میں قدرتِ قادرہ الٰہیہ نے ودیعت فرمائی تھی۔ مولانا مرحوم کا سنِ ولادت تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکا[1]۔ بہرحال آپ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید فرید الدین مرحوم "لکڑے کی خیل" میں رہا کرتے تھے۔ اُن کے دو فرزند تھے۔ ایک مولانا وحید الدین سلیم مرحوم دوسرے ڈاکٹر سید حمید الدین جو پانی پت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ آپ کا انتقال مولانا سلیم کے چار سال بعد ہوا۔ مولانا سلیم کی وفات بعارضۂ سرطان بمقام ملیح آباد یکشنبہ ۱۲ر جولائی ۱۹۲۸ء کو صبح کے وقت ڈاکٹر عبد الکریم صاحب انچارج ہسپتال ملیح آباد کے پاس واقع ہوئی۔ اور آپ کو وہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آپ کے معاصرین کا خیال ہے۔ کہ مولانا کی عمر ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان ہو گی۔

تعلیم۔ مولانا نے مڈل تک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ (مگر بعد میں انٹرنس کر لیا تھا) اور سکول چھوڑنے کے بعد مکتبی تعلیم شروع کر دی تھی۔ اِسی زمانہ میں آپ نے فلسفہ اور اسلامیات کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ آپ کے خیالات میں کچھ تنزلزل بھی آ گیا تھا۔ مگر بہت جلد عقائد صحیحہ پر قائم ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ آپ کے خیالات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ بلکہ ایسے واقعات ہمیشہ بر سبیلِ مزاح پیش آئے ہیں۔ واللہ اعلم

---

[1] ڈاکٹر عبد الحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو ہند کے اندازہ کے مطابق آپ کی عمر اسّی برس کے لگ بھگ ہو گی۔

قیام لاہور۔ آپ پانی پت سے نکل کر لاہور پہنچے۔ اور وہاں عربی ادب کی تعلیم مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے حاصل کی۔ اور تفسیر، فقہ، حدیث، منطق، فلسفہ وغیرہ مولانا عبدالواحد ٹونکی سے پڑھا لاہور میں آپ کو چار روپے ماہوار وظیفہ تعلیم ملتا تھا جس میں دو روپے خود رکھ لیتے تھے۔ اور دو روپے اپنی محترمہ والدہ کیلئے پانی پت بھیج دیتے تھے۔

پانی پت میں مطب۔ مولانا نے جالندھر کے ایک طبیب سے جس کا نام یاد نہیں آتا۔ طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور ڈاکٹری کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ایجرٹن کالج بہاولپور کی شش سالہ ملازمت اور ریاست رامپور کے ہائی سکول میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد آپ پانی پت پہنچے اور مطب شروع کیا۔ جو کئی سال تک نہایت کامیابی کیساتھ چلتا رہا۔ مگر چونکہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ کہ مولانا کی شہرت اور اُن کے کمالات کا دائرہ صرف پانی پت تک محدود رہے۔ اِس لئے مولانا حالی کے ذریعہ آپ کو علی گڈھ پہنچایا گیا۔ اور آپ سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوگئے۔

قیام علیگڈھ۔ مولانا سلیم سرسید کو تصنیف و تالیف میں مدد دینے کے علاوہ "علی گڈھ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سرسید کے انتقال تک جاری رہا۔

ایڈیٹری۔ علاوہ ازیں آپ نے "معارف" "روزنامہ زمیندار" "علی گڑھ گزٹ" اور "مسلم گزٹ" لکھنؤ کی ادارت بھی فرمائی ہے۔ اور ایسے پُر زور سیاسی مقالات لکھتے ہیں کہ حکومت کو "شہر بدر" ہو جانیکے احکام جاری کرنے پڑے۔ اور مولانا کو بادلِ ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ دینا پڑا۔ ایسا ہی واقعہ غالباً لاہور میں بھی پیش آیا تھا۔ اور زمیندار کے پرچے اور پریس کی ضبطی کیساتھ چوبیس گھنٹہ میں مولانا کو لاہور سے نکلنا پڑا تھا۔

حیدر آباد طلب کیگئے۔ مولانا کے فضل و کمال کی شہرت چونکہ اطراف ملک میں پھیل چکی تھی۔ اس لئے اعلیٰحضرت خسرو دکن نے جب "جامعۂ عثمانیہ" کے قیام کا ارادہ فرمایا "تو پہلے" دار الترجمۂ عثمانیہ"

کی تاسیس فرمائی۔ اور اکناف ملک سے گراں قدر مشاہروں پر مترجموں کو بلایا گیا۔

چونکہ مولانا سلیم بھی ہندوستان کے نامور ترین فضلا میں سے تھے۔ اور آپ کو مسئلہ "وضع اصطلاحات" پر ایک خاص عبور تھا۔ اس لئے آپ بھی حیدرآباد طلب کئے گئے۔

وہاں پہنچ کر چند ماہ تک تو مولانا نے وضع اصطلاحات کا کام کیا۔ بعدازاں "جامعہ عثمانیہ" میں بطور مددگار پروفیسر اور پھر بحیثیت پروفیسر اردو ادبیات کی تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ اور اسکے ساتھ ہی "دارالترجمہ عثمانیہ" میں ترجمہ کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ (ابھی معلوم نہیں ہوسکا کہ آپنے کون کون سی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے)۔

طرز معاشرت - مولانا قدیم زمانے کے بزرگوں کی وضع و قطع کے صاف ظاہر اور صاف باطن بزرگ تھے۔ اور اسی طرح بے لاگ آزادگو اور آزاد نگار نکتہ سنج اور ظریف الطبع تصنع اور تکلف ذرا نہ کرتے تھے۔ جس شخص سے ملتے نہایت خلوص اور نیک نیتی سے ملتے۔ جو بات کہتے صاف لاگ لپیٹ ان کو ذرا پسند نہ تھی۔ ملکی سیاسیات پر ایک خاص نظر رکھتے تھے۔

لباس بہت معمولی پہنتے تھے۔ شیروانی، غرارہ، ترکی ٹوپی، اور بوٹ مگر بہت معمولی۔ زیادہ قیمتی جوتا استعمال نہیں فرماتے تھے۔ دلّی کی پھول والی جوتی خاص طور پر پہنتے تھے۔ چھڑی ہاتھ میں ہوتی تھی۔ موزہ پسند نہ فرماتے تھے۔ سر پر بال رکھنے بھی ناپسند تھے۔ غرضیکہ سارا حلیہ مولانا ظفر علیخاں جیسا ہوتا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا۔ کہ آپ بدن کے ذرا بھاری تھے۔ آواز نہایت گرجیلی تھی۔ اور قہقہہ تو جتنی آزادی اور بے تکلفی سے آپ لگاتے تھے۔ وہ انہیں کا حصہ تھا۔ (افلاطون کے نزدیک رک رک کر ہنسنا یا تکلف سے ہنسنا مکر کی دلیل ہے۔ اور بے ساختہ دبے تکلف ہنسنا یا قہقہہ لگانا صاف باطنی کا مظہر ہے۔ البتہ اخلاقیات میں بزرگوں کے سامنے قہقہہ لگانا

مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر مرحوم کی صحبت میں سب اُن سے خورد ہی ہوتے تھے)

چائے۔ پان اور آم۔ آپ کے ہاں چائے اور پان کا شغل بہت عام تھا۔ یہی دو چیزیں تھیں جن کا دَور ہمہ وقت رہتا تھا۔ سال بھر میں ایک ماہ کیلئے آپ پانی پت تشریف لاتے تھے۔ دس گیارہ دن تو حیدر آباد سے پانی پت تک پہنچتے پہنچتے صرف ہو جاتے تھے۔ کیونکہ جب احباب کو معلوم ہوتا تھا۔ کہ مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ تو وہ سٹیشن پر پہنچ کر آپکو زبردستی گاڑی سے اُتار لیتے تھے۔

باقی ایام جو وطن میں گذرتے تھے۔ وہ بہت ہی پُر لطف اور تفریح و انبساط میں گذرتے تھے۔ اکثر آموں کی فصل ہوتی تھی۔ معتقدین و احباب سوغاتیں جو آموں کی صورت میں ہوتی تھیں بھیجتے رہتے تھے۔ بس یہ سمجھئے کہ پارسل کے پارسل لکھنؤ اور ملیح آباد وغیرہ سے چلے آرہے ہیں۔ اور "حلقہ نشینانِ سلیم" تراش تراش کر کھا اور کھلا رہے ہیں۔ مرحوم کے مکان پر ہر وقت ایک ہجوم رہتا تھا جس کے واسطے چائے اور پان تیار کرنے کیلئے ایک ملازم وقف تھا۔

شاعری۔ شاعری کا شوق آپ کو بارہ تیرہ سال کی عمر سے تھا۔ اور اس صغیر سنی ہی میں آپ بہت صاف اور سلجھا ہوا شعر کہتے تھے۔ اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ خوش ذوق سمجھے جاتے تھے۔

سلیم شاعری میں حکیم برکت علی صاحب مرحوم کے شاگرد ہیں۔ جو پانی پت محلہ انصار میں مطب کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب طب کے علاوہ "فن شعر" میں بھی ایک خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ طبیعت درویشانہ تھی۔ آپ "جوگیا" لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک روز تین چار شاعر دوست حکیم صاحب کے پاس پہنچے۔ اور شاگرد ہو گئے۔ ان میں سے ایک مولانا وحید الدین سلیم تھے جن کا تعلق اس وقت مفتون تھا۔ دوسرے میرے جد محترم حکیم حافظ غلام محمد صاحب خستہ دو حضرات کا نام یاد نہیں آتا۔ اگر بھولا نہیں۔ تو تیسرے بزرگ ڈاکٹر عبد الکریم صاحب انچارج بلیج آباد ہسپتال ہیں جن کے پاس مولانا نے انتقال فرمایا ہے۔ بہرحال مذکرہ صدر چاروں دوست حکیم صاحب سے اصلاح لینے لگے۔ مولانا سلیم بہت تیز طبع "ذہین" اور زود فکر ثابت ہوئے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے جو برکت تخلص کرتے تھے۔ دس روز تک چاروں شاگردوں کو اصلاح دی۔ اور گیارھویں دن یہ خدمت مولانا سلیم کو تفویض کر دی گئی۔ اب مولانا اپنے استاد بھائیوں کے استاد تھے۔ اور انہیں اصلاح دینے لگے۔ اصلاحات بہت اچھی ہوتی تھیں۔ اور حکیم صاحب کو کہیں کہیں کوئی لفظ بدلنا پڑتا تھا۔

مشاعرہ۔ اس زمانہ میں پانی پت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں مصرع طرح تھا ع

"جس پر کہ مہربان وہ صنم ہو کے رہ گیا"

اس پر سب نے غزلیں کہیں۔ آپ کی غزل پر مشاعرہ میں دھوم مچ گئی۔ اور اسی روز سے مولانا سلیم کی شہرت کا آغاز ہو گیا۔ اس مشاعرہ کا ایک شعر سن لیجئے۔ غالباً قبلہ خستہ نے فرمایا ہے۔

وہ ناتواں ہوں بیٹھ کے اٹھنا ہے پھر محال

بیٹھا اگر تو نقش قدم ہو کے رہ گیا

عزم و عمل کا پیکر ناطق۔ عام کردار اور ان کے عزائم پر اگر بحث کی جائے۔ تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اسلئے ان کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالئے۔ معلوم ہوگا۔ کہ وہ عزم و عمل کا ایک پیکر ناطق تھے۔ اور انہوں نے کیسی عسرتوں اور زمانہ و ماحول کی مجبوریوں اور سختیوں کو کس قدر مردانہ وار جھیلا ہے۔ یہ باتیں اور ان کی دیگر فطری اور طبعی صلاحیتیں ان کے بیانات سے ظاہر ہونگے۔

قصیدہ غوثیہ۔ طبیعت کے زور و فکر کی رسائی، فارسی زبان کی مزاولت، قدرتِ بیان اور فطری ذوقِ سخن، کا اندازہ لگانے کیلئے مولانا کے ابتدائی کلام کا شاہکار وہ قصیدہ دیکھنا چاہیئے جو انہوں نے سید غوث علی شاہؒ کی مدح میں لکھا ہے۔ جب وہ قصیدہ لکھا گیا ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۴ سال کی تھی اور گلستان کا تیسرا باب پڑھ رہے تھے۔ قصیدہ تذکرہ غوثیہ میں ملتا ہے۔ جب حضرت غوث علی شاہؒ یعنی ممدوحِ مولانا سخت بیمار ہوئے۔ تو آپ نے صاحبِ "تذکرہ" کو چند وصیتیں کیں جن میں سے ایک وصیت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف تذکرہ غوثیہ لکھتا ہے۔ کہ جب نوبت اس وصیت کی پہونچی۔ تو راقم نے حالتِ اضطراب میں اکثر مریدوں کو جو اطراف دور دراز میں تھے خطوط اطلاعی روانہ کئے۔ چند روز میں ایک مجمع کثیر ہوگیا۔ اکثر سخن فہم و شاعر بھی اس جلسہ میں تھے۔ آپ نے سید وحید الدین پسر حاجی سید فرید الدین صاحب مرحوم کو یاد فرمایا۔ اور اس قصیدہ کے پڑھنے کا ایما کیا۔ جو ڈیڑھ روز پیشتر سید وحید الدین نے خدمتِ عالی میں پیش کیا تھا۔ اور اس کے بعد آپ جناب قبلہ نے ایک دوپٹہ باشرفی (جس کو راقم نے اچھی طرح نہیں دیکھا) عطا کیا تھا۔ حالانکہ عمر اس عزیز لڑکے کی ہنوز ۱۴ سال کی تھی۔ اور گلستان کا تیسرا باب پڑھتا تھا۔ لیکن جناب قبلہ کی "نظرِ شفقت" اس کے "شریکِ حال" تھی۔ ایسا زور شور کا قصیدہ پڑھا۔ کہ اس کا سمندِ سخن انوری و خاقانی سے عناں با عناں معلوم ہوتا تھا اور ایسے لطف و خوبی اور دھوم دھام سے اس لڑکے نے مجمع کثیر میں یہ قصیدہ پڑھا۔ کہ اربابِ محفل دنگ و ششدر رہ گئے۔ بعض مستمعین نے اس گمان سے کہ شاید یہ لڑکا طوطی کی طرح زبان گویا رکھتا ہے۔ اور طبیعت اس کی فہم مضامین سے ناآشنا ہے۔ اس کا امتحان کیا۔ اور جو مطالب و اصطلاحات ادق اس کے کلام میں وارد ہوئے تھے۔ اس سے استفسار کئے۔ اس نے ہر ایک سوال کا جواب شرح و بسط کے ساتھ ایسے اسلوب سے بیان کیا۔ کہ گویا اس کی طبع بلند اور اس کا ذہن رسا

ان

ان مباحث و علوم پر حاوی ہے۔" اس قصیدہ کے ۴۰ اشعر ہیں جن میں سے کچھ منتخب اشعار ہم پیش کرتے ہیں۔ سنئے اور غور کیجئے کہ ایک ۱۴ سال کا نوجوان کیہ رہا ہے۔ ے

صبحدم مہرہ از چرخ چو افشاند زچنگ　　خاطر ماشد بلبل بہ ریاض فرہنگ
زد سر پا بسر چرخ سمند خامہ　　کہ بجولاں وہم از زنگ برنگ شبرنگ
طرفہ آئینہ قلبش کہ زتاب عرفاں　　در وانہ جوہر فرد آمدہ کم نقطہ زنگ
عقل و دانش شدہ از جوہر علویش عرض　　جوہر فرد بقلبش فلک اخضر رنگ
یعنی بحر کرم و جود شہ غوث علی　　قبلہ عالم لاہوت وشہ چرخ ادرنگ
کعبہ ہر دو جہاں خسرو خسرو دیہیم　　مسند آرا دشہ کشور عقل و فرہنگ
کاشف سر نہاں واقف علم مکتوم　　حضرت اقدس ظل اللہ و دانش آہنگ
جلوہ تو علم از برق وشش از ذرہ کشد　　ہمچو خورشید لسوز و رخ تابان فرنگ
فیض نور دل شفاف تو آنست کزو　　جگر لالہ بہ تبدیل کشد نقطہ زنگ
جوہر کل نجم آید بظہور عقلت　　ذات پاکت شدہ محور بجہان فرہنگ
مگذار و غضبت گرچہ عدو بگریزد　　پہن ارض وفلک آید نظرش ساحت تنگ

قصیدہ کی شانِ نزول عنوانِ گذشتہ کی خط کشیدہ سطور پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ قصیدہ مذکور سنانے سے بیس روز پیشتر لکھا گیا۔ اور غوث صاحب کی نظر شفقت مولانا کے شریک حال تھی ۲۶ سنہ کا ذکر ہے۔ کہ مولانا پانی پت تشریف لائے ہوئے تھے دوپہر کا وقت تھا۔ اور بہت سے ذی علم حضرات جمع تھے۔ کہ کسی صاحب نے اسی قصیدہ غوثیہ کے متعلق استفسار کیا۔ مولانا نے فرمایا۔ کہ ایک روز حضرت غوث علی شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ کہ آج تم کوئی نظم لکھو۔ اور

چونکہ فارسی پڑھ رہے ہو۔ اِس لئے فارسی میں کہتو۔ میں نے عجز طبع کا عُذر کیا۔ مگر آپ نے اصرار فرمایا۔ اور یقین دِلایا۔ کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔ جاؤ خدا پر بھروسہ کرو اور لکھو!

مولانا فرماتے ہیں۔ کہ میں نے حسب حکم گھر پہنچ کر فکر شروع کی پہلے تو کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر بعد مایوسی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اشعار موزوں ہونے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۰۳ شعر کا قصیدہ مرتب ہوگیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا۔ کہ یہ غوث صاحبؒ کی توجہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ میں حیران تھا۔ کہ میں نے یہ قصیدہ کیونکر لکھا۔ بالفاظِ دیگر آپ نے صاحب تذکرۂ غوثیہ کے اس قول کی تصدیق فرمائی۔ کہ "جناب قبلہ کی نظرِ شفقت اس کے شریک حال تھی"۔ یہ ایسا ہی واقعہ ہے جیسا خواجہ حافظ شیرازی کیساتھ پیش آیا تھا۔ اور اُنہوں نے حضرت حمزہؓ کی توجہ سے وہ غزل لکھی تھی۔ جس کا مطلع ہے ؎

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

مولانا شبلی کو حافظؒ کے واقعہ میں خوش اعتقادی نظر آتی ہے۔ شائد بعض لوگ اس واقعہ کو بھی ایسا ہی سمجھیں۔ لیکن اس کی شہادتیں اور شاہد ابھی موجود ہیں۔ البتہ "مادئیین" جو "روحانیات" کے قائل ہی نہ ہوں۔ وہ کچھ بھی خیال فرمائیں۔

وضع اصطلاحات۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے۔ کہ مولانا "دارالترجمہ عثمانیہ" کے بھی رُکن تھے۔ اس لئے آپ نے اکثر کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ مگر ہمیں ان کی کوئی اطلاع حاصل نہیں ہوسکی۔ آپ کی مشہور اور علمی تصنیف "وضع اصطلاحات" ہے۔ جو اپنے موضوع پر سب سے پہلی اور "دریائے لطافت" کے بعد دوسری کتاب ہے۔ جس میں اردو زبان کی چھان بین کے ساتھ ایسے عمدہ اور مفید اصول و قواعد مدّون کئے گئے ہیں کہ اگر اُن کو سامنے رکھ کر اردو زبان کو بڑھایا جائے۔ اور اُسے ترقی دی جائے

تو

تو وہ دنیا کی زبردست علمی اور وسیع ترین زبانوں میں ممتاز ترمقام حاصل کر سکتی ہے ۔ اور درحقیقت اب وقت بھی آگیا ہے ۔ کہ ہمی خواہانِ اردو یا ہندوستانی "وضع اصطلاحات کو سامنے رکھیں ۔ اور اس کے پیش کردہ اصول ومبادیات پر عمل پیرا ہوں ۔ (انشاء اللہ "وضع اصطلاحات" پر جداگانہ مقالہ سپرد قلم کیا جائیگا۔

دیگر تصانیف وتراجم تراجم میں جو مرحوم نے زمانہ قیام پانی پت میں کئے ۔ چند مختصر عربی ناولوں کے ترجمے ہیں ۔ آپ نے اسی زمانے میں یعنی علی گڈھ وغیرہ کے جانے سے پیشتر ایک پریس بھی جاری کیا تھا ۔ جس کے ساتھ "نیشنل بکڈپو" یا قومی بکڈپو" کے نام سے ایک کتب خانہ بھی تھا ۔ بعض حضرات نے بتایا ۔ کہ مولانا نے دورانِ قیامِ وطن میں اکثر کتابیں لکھی ہیں ۔ مگر اُن پر اپنے نام کی جگہ صرف "بکڈپو" کا نام لکھ دیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ "زمیندار" میں "ایک بنرل مسلمان" کے نام سے جو کلام چھپا ہے ۔ وہ مولانا کا کلام ہے ۔ (مذکورۂ صدر کتابوں کے متعلق پانی پت سے اگر کوئی صاحب معلومات بہم پہنچائیں ۔ تو نہایت شکریہ کا موجب ہوگا ۔

مقالات ۔ مولانا نے بیش نفد، علمی، ادبی اور سیاسی مقالات لکھے ہیں ۔ جو اُن کے اپنے زیرِادارت اخبارات اور دیگر ملکی جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپے ہیں ۔ جن میں سے چند مقالات کا پتہ چلا ہے ۔ اور وہ افادات سکیم" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہو گئے ہیں ۔ باقی ہنوز زیرِ تحقیق ہیں (کاش کوئی بزرگ انکو تلاش کرنے کی یادگار اور شکور سعی فرمائیں ۔ جس طرح انکی نظمیں تلاش کرلی گئی ہیں)

مجموعۂ کلام ۔ مولانا موصوف کے کلام کا ایک حصّہ اخبارات ورسائل سے تلاش کر کے میں نے اور بعض دیگر احباب نے جمع کیا تھا ۔ جو شائع ہو چکا ہے ۔ مگر فرصت ہے ۔ کہ اس کو دوبارہ تصحیح لیساتھ شائع کیا جائے ۔ نیز ابھی نہ معلوم مرحوم کا اور کتنا کلام ہے ۔ جو معرضِ انتشار وگمنامی میں پڑا ہوا ہے ۔ جس کو تلاش کرنا نہایت ضروری ہے ۔ آپ کے پاس ایک نوٹ بک رہا کرتی تھی ۔ جس میں وہ اپنی نظمیں نقل کرالیا کرتا تھے ۔ اس کا پتہ نہیں چلا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علالت کے زمانہ میں یا تو ضائع ہوگئی ۔ یا کسی نے اڑالی ۔ بہرحال ان کا کلام پُرانے جرائد وصحائف میں ضرور موجود ہے ۔

کھیل

(PLAY)

(از خامۂ جناب پنڈت گوپال کرشن صاحب گوڑ ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ نارمل سکول کرنال)

بچے میں اپنے عضلات کو حرکت دینے کا محرک بچپن ہی سے موجود رہتا ہے۔ بچوں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ کھیل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کھیل ان کی طبعی فطرت کا ایسا ہی جزو ہے جیسے کہ کھانا، پینا، سونا

تعریف اور مفہوم

اکیلے میں یا دوسروں کے ساتھ مل کر آزادی سے دل بہلانے کے واسطے جو کام ہوتا ہے۔ اس کو کھیل کہتے ہیں۔ دیگر کاموں کا نتیجہ خاتمے پر ظاہر ہوتا ہے۔ مگر کھیل میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ کہ فعل کا جو ماحصل ہوتا ہے۔ اس کا احساس فاعل کو فعل کے عمل کے دوران ہی میں ہونے لگتا ہے۔ جب کوئی کھیل اجرت حاصل کرنے کیلئے یا دوسروں کو خوش کرنے کیلئے یا کسی خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر کھیلا جائے۔ تو وہ کھیل نہیں رہتا۔ بلکہ کام ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی کام مثلاً زراعتی فارم پر گوڈی کرنا آزادی سے اس طرح کیا جائے کہ اسکے کرنے میں لطف حاصل ہو۔ تو اس کام کا شمار بھی کھیل میں ہو جاتا ہے۔ کھیل، کام اور بیگار تینوں مختلف ہیں۔ گو محض عضلات کو حرکت دینے کے لحاظ سے تینوں یکساں ہیں۔ لیکن نقطۂ نظر جداگانہ ہے۔ کام میں ذاتی ضروریات کی تکمیل مدنظر ہوتی ہے۔ اور کسی خاص شعوری مقصد پر جو نتیجہ کے طور پر حاصل ہوگا۔ توجہ لگی ہوتی ہے۔ بیگار میں کام دوسرے کی جانب سے تجویز کیا جاتا ہے۔ اور کھیل میں آزادی کا خیال اور فعل سے محض اس فعل کی خاطر لطف اندوزی ہوتی ہے۔ کسی شعوری مقصد کا

موجود رہنا یانہ رہنا چنداں اہم نہیں ہوتا۔

کھیل اور جسمانی تربیت

تعلیم میں اس کا استعمال

(۱) جسمانی تربیت تین طرح پر ہو سکتی ہے۔ (۲) بذریعہ جمناسٹک۔ (۳) بذریعہ کام (۴) بذریعہ کھیل۔ جمناسٹک سے جو تربیت حاصل ہوتی ہے محض فوجی مہارت کے کام آسکتی ہے۔ اسی طرح کام کے ذریعہ حاصل شدہ جسمانی تربیت بھی روزمرہ کے کام نہیں آتی۔ آج کل جسمانی تربیت کیلئے صرف کھیل ہی ایک موزوں ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے بخوبی استفادہ اٹھاتے ہوئے اعضا کو اچھلنے کودنے پھاندنے وغیرہ کے کھیلوں میں لگایا جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ اچھے قوی اور طاقتور ہو سکیں۔ خون کا دورہ تیزی سے ہو۔ اور پھیپھڑے اچھی طرح کام کر سکیں۔ جسم کی اندرونی کثافت پسینے کے ذریعہ خارج ہوتی رہے۔ جسم کو چستی اور چالاکی حاصل ہو۔ جسمانی کاموں کو خوش اسلوبی کیساتھ سرانجام دے سکیں۔

کھیل اور عقلی تربیت

فطرتاً بچہ کھیل ہی کے ذریعہ اپنے تجربہ کو وسعت دیتا ہے۔ اور ماحول اور دیگر اشیاء کے متعلق ضروری واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ بچے اشیاء سے کھیلتے ہوئے ان کے قد، حجم، رنگ و شکل وغیرہ کے مدرکات حاصل کر کے اپنے تجربہ کو وسعت دیتے ہیں۔ منظم کھیلوں میں توجہ، تفکر اور تخیل کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ قوت فیصلہ کی تربیت جس قدر کھیل میں ہوتی ہے۔ مدرسہ کی نصابی تعلیم میں وہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتی۔ مدرسہ کی جماعت میں کبھی کبھار ہی جدید فیصلوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے کھیل میں ہر لحظہ نئی نئی صورتیں رونما ہونے کی وجہ سے ہر وقت جدید فیصلہ کا عمل در پیش رہتا ہے۔ مثلاً فٹ بال میں گول کے ایک صحیح ٹھوکر مارنا سمت۔ زاویہ قوت ہر بات کا فوری فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ تماشائی اچھے فیصلہ

کی داد دیتے ہیں۔ اور غلطی یا سہو کا تمسخر اڑاتے ہیں کھیل میں صحیح نفسی؟ مستعدی وصلاحیت کی عادات کی بخوبی تربیت ہوتی ہے۔ کیونکہ کھیل میں بچہ اپنی ذات کو نظر انداز کرکے ہمہ تن کھیل میں محو ومنہمک ہوجاتا ہے۔

کھیل اور سماجی تربیت

کھیل میں بچہ بخوبی معلوم کرنے لگتا ہے۔ کہ ہم صحبتوں کے بغیر زندگی کا کچھ لطف نہیں کھیل ہی میں وہ امداد باہمی اور تعاون کے فوائد کو بھی بخوبی معلوم کرلیتا ہے۔ کھیل میں ٹیم کی خاطر وہ اپنی ذاتی خودغرضانہ خواہشات کو رضاکارانہ طور پر بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ وہ کھیل کے سادہ قواعد کے سامنے جھک جاتا ہے۔ تاکہ دوسرے کھلاڑیوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ الغرض قانون کی پابندی اور معاشرتی معیار و قواعد اور باہمی حقوق کی شناخت اور احساس کھیل کے ذریعہ ہی بچہ حاصل کرتا ہے۔ کپتان کے حکموں کی تعمیل سے وہ سبق سیکھتا ہے۔ جو نصابی تعلیم سے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔

کھیل اور عملی زندگی کی تربیت

کھیل ہی کے ذریعے خاصی محنت اور مشقت سے زیادہ دیر تک کسی کام میں لگے رہنے کی مشق کرنے سے اور جفاکشی اور تندہی سے کام کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ اور یہ عادت عملی زندگی میں بہت مفید ثابت ہوتی۔

کھیل اور شہریت

کھیل کے میدان میں امیر وغریب تمام بچے بلالحاظ ذاتی مراتب مساویانہ حیثیت سے حصہ لیتے ہیں۔ کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ صرف اچھے کھلاڑی کی ہی قدر ہوتی ہے۔ خواہ وہ غریب ترین گھرانے کا ہی کیوں نہ ہو۔ ہر ایک کے لئے ایک ہی قسم کے احکام ہوتے ہیں۔ جن کی پابندی سب پر لازمی ہے۔ اس طرح بہترین اخلاقی و مدنی تربیت کھیل ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کیونکہ انفرادیت کو نظرانداز کرتے ہوئے ٹیم کیساتھ وفاداری کی تربیت ہوتی ہے جس سے عمدہ شہری بننے کا احساس ہوتا ہے۔

تعلیم میں عملی استعمال

پس مدرس کو چاہیئے۔ کہ سکول کے کام کو جہاں تک ممکن ہو کھیل میں تبدیل کردے اور تعلیم کی کڑوی گولی کو حلق سے اُتارنے کیلئے اُس پر مفید مطلب کھیلوں کی چاشنی چڑھادے۔ کنڈر گارٹن اور مانٹیسوری میتھڈ کی بنا کھیل پر ہی ہے۔ اور وہ اسی لئے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے لئے چارٹ اور کارڈ اور تصاویر مُہیا کرے۔ کہانیوں اور پہیلیوں کے ذریعہ تعلیم دے حساب کیلئے گولیوں۔ تیلیوں۔ کاغذ کی رنگ دار پٹیوں۔ سکوں اور دیگر بآسانی دستیاب ہونے والے سامان کے ساتھ سبق کو دلچسپ بنائیے۔ بالفریم وغیرہ کے ذریعہ پہاڑے اور گنتی سکھائے۔ جغرافیہ اور مطالعہ قدرت کے لئے تعلیمی سیریں۔ موڈل۔ نقشہ جات اور میجک لینٹرن وغیرہ کام میں لائے۔

فوائد

۱۔ کھیل ایک ایسا دروازہ ہے۔ جس کے ذریعہ ہم دنیا کے بڑے بڑے کاموں کو سرانجام دینے کے لئے میدانِ عمل میں کودتے ہیں۔

۲۔ کھیل کے ذریعہ ہماری ذات کُلّی طور پر تحریک میں مشغول ہو جاتی ہے۔ اور ہم میں عاداتِ حسنہ پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

۳۔ کھیل سے ہم میں ذاتی سعی اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ مجلسی کارروائیوں میں شرکت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ آزادی سے از خود کام کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ مقابلہ میں شکست کو برداشت کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

پس کھیل ایک ایسی قابلیت ہے جو ہم سب کو اخلاقِ حسنہ سکھاتی ہے۔ اور کامیاب انسان بننے میں حد سے زیادہ مدد دیتی ہے۔

رام

فرمودہ حضرت علامہ اقبال مرحوم

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

پہیلی متعلق گھڑیال

(از حکیم مومن خان دہلوی)

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے
نہ لفظ اور معنے سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پر وہ لٹکتا رہے
زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

تیری یاد

(تخیلات جناب چودھری غلام رشید خانصاحب صدر قرضہ بورڈ کرنال)

مضمون ہذا کیلئے ہم محترم چودھری صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہجوم مشاغل کے باوجود ہماری درخواست پر یہ مضمون عطا فرمایا۔ اُمید ہے آئندہ بھی آپ ہمیں ممنونیت کا موقع دیتے رہیں گے۔ (ادارہ)

میری طویل زندگی کا ہر ورق تیری یاد سے شروع ہوتا ہے۔ اور تیری ہی یاد پر ختم۔
(کیا تیری یہ شکایت کہ میں تجھے یاد نہیں کرتا حق بجانب ہے ؟)

ہر شب نیندوں کی دیوی کا خیر مقدم کرنے سے پہلے میں اپنی زندگی کی واحد دلچسپی "تیری یاد" میں ایسا کھویا جاتا ہوں۔ جس طرح دھیمے دھیمے نغمے سکوت کی فضا میں گم ہو جاتے ہیں۔ وفورِ شوق میں خیال کی سرعت کیساتھ میں تیری تلاش میں جاتا ہوں۔ تاکہ تجھے لاؤں۔ اور ہمیشہ کیلئے اپنے دل کی واحد ملکہ بناؤں۔ مگر اپنی نامکمل دنیا۔ گناہ آلود دنیا کو تیری نزہت وتکمیل کی ضد پاکر میں آسمانوں اور زمینوں کا جائزہ لیتا ہوں۔ اور زمینوں اور آسمانوں کی اچھی چیزیں خوبصورت خوبصورت چیزیں تیرے لئے فراہم کرتا ہوں۔ سمندروں کی گہرائیوں سے چمکدار چمکدار موتیوں اور آسمانوں کی رفعتوں سے تابندہ تابندہ ستاروں کی جھولیاں بھر لاتا ہوں

پھر اس زمین سے ٹھکرا اس آسمان سے بچکر اس دنیا سے دُور پار ایک خراماں خراماں بہنے والی ندی کے کنارے جہاں عطر بیز ہوائیں پانی کے دھیمے دھیمے سروں میں نغمے کوٹ کوٹ کر بھرتی ہیں۔ جہاں سنہرے آبشاروں کے میٹھے میٹھے گیتوں پر سر دھنتا ہے۔ جہاں حسن وعشق گلے ملتے ہیں جہاں سکوت ہی سکون ہے۔ اور موسیقی ہی موسیقی برستی ہے۔ وہاں اس دنیا سے دور میں ایک اور دنیا بساتا ہوں۔ اس دنیا میں تیرے لئے ایک چھوٹا سا خوبصورت سا گھر تعمیر کرتا ہوں۔ فرش

منبرہ کا۔ دیواریں نور کی۔ چھت کرن کے پھولوں کی۔ چھت میں جھل مل جھل مل کرتے ستارے آویزاں کرتا ہوں۔ اور فرش پر سمندروں کا جنس گراں سایہ بکھیر دیتا ہوں۔ اس جھلملاتے مخملی فرش پر رنگا رنگ پھولوں کی مسہری تیار کرتا ہوں۔ اور پھر تیری تلاش کرتا ہوں۔ تجھے ڈھونڈ کر لاتا ہوں تجھے اس مسہری میں لوریاں دے دے کر سلا دیتا ہوں۔

نیندوں کی دیوی جس وقت تیری پرستش کرتی ہے۔ میں اس پجاری کو اپنی ملکۂ دل کی پاسبانی کرتا چھوڑ کر پاس ہی ندی کے کنارے اپنی کاوشوں کی خوش انجامی میں کھو جاتا ہوں۔

صبح سویرے نور کے تڑکے جب میری آنکھ کھلتی ہے۔ تو تجھے محوِ خواب پاتا ہوں۔ میں تیرے آرام میں مخل نہیں ہوتا۔ بلکہ دبے پاؤں قضاو قدر کے ہمراہ ہو لیتا ہوں۔ اور اپنے روزنامچہ میں حاضری لکھا۔ اس دنیا کی سخت اور کڑی حقیقتوں سے بغلگیر ہو جاتا ہوں۔

اقوالِ زریں

۱۔ تمہارا دل آئینہ ہے۔ اس پر گناہ کی گرد نہ پڑنے دو۔

۲۔ تمہارا جسم خدا کی امانت ہے اُسے کمزور نہ ہونے دو۔

۳۔ تمہارا چال چلن تمہاری دولت ہے۔ اسے ضائع نہ ہونے دو۔

۴۔ نیک غریب بڑے امیر سے بہتر ہے۔

۵۔ جو لڑکا طالب علمی کے زمانے میں اپنا سبق یاد نہیں کرتا۔ وہ بڑا ہو کر بھی اچھا آدمی نہیں بن سکتا۔

۶۔ جو آدمی ورزش کے لئے چند گھنٹے نہیں نکال سکتے وہ بیماری کیلئے ہفتے نکالنے کیلئے تیار رہیں۔

۷۔ علم اقبال کی ماں ہے۔ (۸) جھوٹ متعدی بیماری ہے۔ اس سے دُور بھاگو۔

۹۔ سستی ڈاکو ہے اس سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

دیہات سدھار ٹریننگ

از جناب مولوی محمد منیر صاحب اورنٹیل ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال

گذشتہ سے پیوستہ

تیرھواں لیکچر۔ امداد باہمی اور اس کے اختلافات:۔

ابتدائے آفرینش میں زندگی اس قدر سادہ تھی۔ کہ ہر انسان اپنی ضروریات کا خود ہی کفیل ہو جاتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اور بنی نوع انسان ترقی کرتا گیا۔ ضروریات زندگی بھی بڑھتی گئیں جب تک دنیا میں سکہ معرض وجود میں نہ آیا۔ لوگ جنسوں کا باہمی تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا۔ کہ اس تبادلے کی دقتیں اور قباحتیں محسوس ہونے لگیں۔ چنانچہ سکے کا رواج ہوا۔ جب لوگوں نے اُس کے قواعد ملاحظہ کئے۔ تو اُسے جمع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ اُس کی خاطر مکروفریب اور دغا بازیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اور وہ زمانہ آ گیا جو سرمایہ داری کا زمانہ کہلاتا ہے۔

سرمایہ داری کی خرابیاں:۔

۱۔ تمام ملک کی دولت چند اشخاص کے پاس چلی جاتی ہے۔

۲۔ قوم برباد ہو جاتی ہے۔

۳۔ سرمایہ دار اور مزدور میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔

سرمایہ کی زیادتی مشینری کی ایجاد کا موجب بنی۔ اور مشینری کی ایجاد سے بیکاری بڑھ گئی۔ ہزاروں مزدور بیکار ہو گئے۔

اشتراکیت اٹھارھویں صدی میں اہالیانِ یورپ نے اس بیکاری کے سدِباب کی خاطر تحریک جاری کی جس کی بدولت تمام انتظام سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلا گیا

اور مزدور کو کچھ مزدوری ملنے لگی ۔

اشتراکیت کے اصول :۔

۱۔ مالک قوم یا حکومت ہوتی ہے ۔
۲۔ اس تحریک میں ہر انسان کو جبراً شامل ہونا پڑتا ہے ۔ مگر جبر انسانی فطرت کے خلاف ہے۔
۳۔ تمام انسانوں کی حیثیت برابر ہوتی ہے ۔
۴۔ تمام کاروبار مشترکہ ہوتے ہیں ۔
۵۔ تمام انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔
۶۔ کوشش کی جاتی ہے ۔ کہ صرف اتنی چیزیں پیدا کیجائیں ۔ جتنی کہ درکار ہیں ۔
۷۔ تمام دولت قوم کی ہوتی ہے ۔ نہ کہ کسی شخص واحد کی ۔ کیونکہ ملکیت ذاتی سے خودغرضی حسد اور لالچ پیدا ہوتا ہے ۔
۸۔ بانیٔ تحریک ہر جائز و ناجائز طریق سے اپنا مقصد حاصل کرتا ہے
۹۔ اول اول یہ تحریک قومی اور مذہبی تھی ۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے سیاسی صورت اختیار کرلی چنانچہ جہاں جہاں بھی یہ تحریک جاری تھی ۔ وہاں بغاوتیں شروع ہوگئیں ۔

اشتراکیت کی مختلف صورتیں :۔

۱۔ قومیت ۔ صرف قوم یا ملک میں محدود ہوتی ہے ۔ جبر و تشدد اور باغیانہ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے
۲۔ تحریک بالشویزم ۔ روس میں ۱۹۱۷؁ء سے شروع ہوئی ۔ اس تحریک میں دولت و پیداوار کے علاوہ بیوی ۔ بچے حتیٰ کہ مذہب بھی بادشاہ کا ہوتا ہے ۔ اسمیں حد سے زیادہ جبر و تشدد کیا جاتا ہے
۳۔ شراکت یا حصہ داری ۔ یہ تحریک تجارت مزدوروں یا کارخانوں تک ہی محدود ہے ۔ اس کے اصول یہ ہیں ۔ کہ سرمایہ دار اور مزدور میں صلح کرائی جائے ۔ اور مزدور کو علاوہ مزدوری کے نفع بھی دلایا جائے ۔ انتظام مزدور کرتے ہیں اور نفع و نقصان کے وہ حصہ دار بھی ہوتے ہیں اس تحریک میں سرمایہ کی طاقت کو تباہ نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ اسکی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے کام کرتے

ہیں

ہیں۔ مگر اس تحریک میں نقص یہ واقع ہوگیا۔ کہ اگرچہ یہ شروع شروع میں محض اقتصادی تحریک تھی۔ مگر بعد میں سیاسی صورت اختیار کرگئی۔

۴۔ ٹریڈ یونین۔ مزدوروں میں تنظیم پیدا کی جائے۔ اور ان کی شکایات رفع کی جائیں۔ اور مطالبات بزور سرمایہ داروں سے منوائے جائیں۔ اس تحریک میں ہڑتال کا ایک بڑا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت میں خامیاں :۔

۱۔ حقوق ملکیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جس سے محنت کا جذبہ ترک ہو جاتا ہے۔

۲۔ آرام طلبی اور عیش پرستی بڑھ جاتی ہے۔

۳۔ تمام کاروبار کی منظوری حکومت سے لی جاتی ہے۔ جس سے بعض اوقات منظوری آنے تک کام کا موقع ہی گذر جاتا ہے۔

۴۔ شخصی اقتدار کو مٹا کر حکومت کو سرمایہ دار بنایا جاتا ہے۔ جس سے سرمایہ داری کی خرابیاں جوں کی توں قائم رہتی ہیں۔

۵۔ جبر و تشدد روا رکھا جاتا ہے۔ جس سے بدامنی اور بغاوت پیدا ہو جاتی ہے۔

۶۔ سب سے بڑا عیب اس تحریک میں یہ ہے۔ کہ یہ غربا کی حامی نہیں۔ بلکہ سرمایہ داروں کو مٹا کر غریب بناتی ہے۔

۵۔ امداد باہمی۔ اشتراکیت کی پانچویں صورت امداد باہمی ہے۔ اور اسے اُن تمام خامیوں سے جو اشتراکیت میں پائی جاتی ہیں پاک کردیا گیا ہے۔ یہ ایک طریقہ تنظیم ہے۔ جس میں اشخاص اپنی رضامندی سے اپنے ہی مفاد کے لئے دیانتدارانہ کام کی خاطر جمع ہوتے ہیں۔ اس کے اصول یہ ہیں :۔

۱۔ لوگ اپنی مرضی سے شامل ہوتے ہیں کوئی جبر نہیں۔

۲۔ ہر شخص چونکہ اپنے نفع و نقصان کو سوچ کر شمولیت کرتا ہے۔ اسلئے وہ دلچسپی لیتا ہے۔

۳۔ سرمایہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ رائے رکنیت کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ حصّوں کے لحاظ سے۔

۴۔ ممبر منتخب کئے جاتے ہیں۔

۵۔ چونکہ ارکان صرف اقتصادی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ کہ مذہبی یا سیاسی مفاد کو اس لئے اس میں پھوٹ پڑنے کی گنجائش نہیں۔

۶۔ لوگ مساوات کے اصولوں پر شمولیت کرتے ہیں۔ اور جتنی مساوات زیادہ ہوگی اتنی ہی ان میں ہمدردی اور قربانی زیادہ ہوگی۔

۷۔ روپے محنت اور وقت کی کفایت شعاری سکھائی جاتی ہے۔

۸۔ ہر کاروبار علانیہ دیانتدارانہ طریق سے ہوتا ہے۔

امداد باہمی اور اشتراکیت میں فرق

امداد باہمی	اشتراکیت
۱۔ شخصی اقتدار اور ملکیت کے حق میں ہے۔	شخصی اقتدار کو منافی ہے۔
۲۔ شمولیت اپنی رضامندی پر منحصر ہے۔	جبراً شامل کیا جاتا ہے۔
۳۔ خالصتاً اقتصادی تعلیم ہے۔ مذہب یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں	شروع میں گو مذہبی تحریک تھی مگر اب سیاسی ہو گئی۔
۴۔ ہر ایک کی خدمت مساوی کرتی ہے۔	خالص قومی تحریک ہے۔
۵۔ سرمایہ دار اور مزدور کی حفاظت یکساں کرتی ہے۔	سرمایہ داری کے اصول کو تباہ کر کے لوگوں کو غریب بنایا جاتا ہے۔
۶۔ غریب کو امیر بنا کر مساوات قائم کی جاتی ہے	امیروں کو غریبوں کے برابر کیا جاتا ہے۔
۷۔ کوئی جماعت بندی نہیں۔	کئی قسم کی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

پنجاب میں کونسی تحریک مفید ہے۔ کاشتکاروں کے لئے تحریک اشتراکیت اچھی نہیں۔ البتہ ان ممالک میں جہاں زیادہ آبادی غیر کاشتکار ہے یہ تحریک بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن پنجاب میں جہاں ۹۰ فیصدی آبادی کاشتکار ہے۔ اگر کوئی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف "امداد باہمی" کی تحریک ہے۔

(باقی)

سحرِ نغمہ

(از حکیم رفیق احمد خانصاحب بکیس۔ کرنالی)

رات کے افسردہ سکوت میں ستار کے نغمہ کی ہوش ربا گت آہستہ آہستہ فضائے اثیری میں جذب ہو کر سارے عالم پر کیفیت بیخودی چھا رہی تھی۔ بیابان کے سیاہ فام درخت جن کی فلک بوس چوٹیاں چاند کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ محویت میں چپ چاپ کھڑے سُن رہے تھے۔ کسی پتّے میں جنبش کی تاب نہ تھی۔ ہوا نے سانس لینا بند کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ فلک نیلگوں درخشاں ستارے نظریں نیچی کئے اس سحر پرور موسیقی پر ہمہ تن گوش تھے۔

نغمہ زن کی انگلیاں کسی الہامی قوت کے ماتحت ستار کے تاروں پر کھیل رہی تھیں۔ موسیقی، کا ہے بلند مرتبہ عبارت انسان کے دل کو بھڑکا دینے والے سُر سے پُر ہو جاتی۔ اور گاہے داستانِ غم و اندوہ کے افسانوں سے لبریز اور گاہے ناکام آرزو کے افسانوں، پیاسا جذبات کی داستانوں اور تشنۂ محبّت کے رازوں سے معمور۔ پھر اسکی تیزی بڑھنی شروع ہو جاتی۔ سُننے والے دل پر ایک لُطف انگیز سرور چھا جاتا۔ اور آرزوؤں کی اُجلی اُجلی پریاں اُسکے آنکھوں کے روبرو رقص کرتے دکھائی دینے لگ

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ صفیہ اپنے دار المطالعہ میں بیٹھی نہایت انہماک سے پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُس کا امتحان قریب تھا۔ اور باقی ماندہ ایام میں اُس کے لئے اپنی جملہ نصاب کی کتابوں کا عبور ضروری تھا۔ ایف۔اے کے امتحان میں اپنے ذہن رسا اور مشقت کی بدولت درجہ اوّل حاصل کر چکی تھی۔ اور بی۔اے میں یونیورسٹی میں سب سے سبقت لے جانے کی پاک تمنائیں۔ اُس نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔

آج مطالعہ کرتے ہوئے اُسے کامل چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور وہ اب اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد جو سخت محنت کا لا نتیجہ ہے محسوس کر رہی تھی۔ کرسی سے اُٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ایک مستانہ انگڑائی لیتے ہوئے نیم باز آنکھو باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک نرالا منظر اُس کے پیش نظر تھا۔ رات ہزاروں لاکھوں میں ایک تھی۔ گُل شبو کی روح پرور بھینی بھی خوشبو۔ ماہتاب کی روپہلی کرنوں پر سوار ہو کر دزدیدگی سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اور اُسے باہر بلا کر اُس کے پریشان

کو فرحت پہنچا دینے کی دعوت پیش کر رہی تھی۔ کیا حسین رات تھی۔ بے اختیار رہ رہ کر اُس کے دل میں یہی آتا تھا۔ کہ باہر جاکر اس صحت بخش رات کو چاند کو تکتے اور تاروں کا دلفریب رقص دیکھنے میں بسر کردے۔

انگریزی شعراء کے قول کے مطابق دیوانوں اور چاند میں ایک خاص تعلق ہے۔ جب کسی شخص میں دیوانگی کے آثار نمودار ہوجاتے ہیں۔ تو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص چاند کے زیر اثر ہے۔ ہاں بعض اوقات انسان کے لئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ چاند کو دیکھ کر دیوانہ ہوجائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ کمرے میں بند ہو اور خشک کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اور وہ بھی امتحان کے لئے۔ "ڈکنسن" نے کیا خوب کہا "دیوانگی میں ایک لذت ہے جس سے صرف دیوانے لذت اندوز ہوسکتے ہیں"۔ اور یہ بھی کتنا اچھا خیال ہے کہ تین اشخاص سالم العقل نہیں۔ شاعر، دیوانہ، عاشق۔ (شاید یہ قول کو پراج کا ہے)۔ اور پھر ایک لخت ستار کی دھم گونج نے اُس کے تخیل کو درہم برہم کردیا۔ اس بے وقت موسیقی سے خدا معلوم کیوں وہ خوف زدہ ہوگئی۔ صفیہ کا بنگلہ آبادی سے بہت دور تھا۔ اور گرد و نواح میں کوئی دوسرا مکان بھی نہ تھا۔ جہاں سے یہ آواز آسکتی ہو۔ آخر اس سنسان مقام پر اس وقت کون ستار بجا رہا تھا۔

پلنگ پر سے ایک ہلکی سی شال کھینچ۔ کاندھوں پر ڈال سلیپر پہن وہ جھٹ کمرے سے باہر ہوگئی۔ اور بنگلے کے ننھے سے باغ میں ہوتی ہوئی پھاٹک پر جا کھڑی ہوئی ستار کا دلدوز ترنم سیدھا اُس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اور کہیں قریب سے ہی آتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے قبل اس کے کان ایسے دلربا نغمہ سے کبھی لطف اندوز نہ ہوئے تھے۔ نغمہ کی دلافروز لَے نے صفیہ کو مدہوش کردیا۔ اُس کا دل ستار کے زیر و بم کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔

دیر تک وہ کھڑی سنتی رہی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس ساحر موسیقی کی ہر لہر فضا میں رقص کرتی ہوئی اُس کے قلب پرسرور کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جارہی ہے اور پھر یک لخت کسی جذبہ کے اثر سے وہ کانپ اُٹھی۔ اُس کے دل میں خیال آیا۔ کہ اس سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اور چل کر دیکھنا چاہیئے۔ کہ نغمہ کا بانی کون ہے۔ بس وہ بڑھی اور بڑھتی گئی۔ خاموش اور خود فراموش راگ کی گدازیت بے طوق و زنجیر اپنی مقناطیسی قوت سے اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور صفیہ بلا رکاوٹ کھنچی چلی جارہی تھی۔ چلتے چلتے دفعتہً وہ رک گئی۔ اُس کا سانس پھولنے لگا۔ اور کلیجہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نغمہ ساز پر اُس کی نظر پڑ گئی تھی۔ صفیہ سے کچھ ہی دور شعاعِ نور سے معمور ایک سیمابی چشمہ بکھیر دوں کی

چٹانوں میں پیچ و خم کھاتا تنفّل کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ کنارے ایک چٹان پر نغمہ زن ستار گود میں لئے گم سم بیٹھا تھا۔ اور پیچھے ایک بڑی مرمری چٹان پر اس کا عکس صاف و شفاف آسمان کے خلاف پڑ رہا تھا۔ جس میں اس کے خط و خال بہ خوبی سے ابھر رہے تھے۔ گویا فنی کو کسی مصور نے بٹھا کر اس عکس کو مکمل کرنے کی خاص کوشش کی ہے اکثر ایسی عکسی تصویریں صفیہ نے سینما کے پردہ پر دیکھی تھیں۔ مگر آج ایک جیتی جاگتی ہستی کا منظر اس کے پیش نظر تھا۔

تھوڑے سے باادب فاصلے پر صفیہ کھڑی تھی۔ کوئی غیر معلوم قوت اسے گھر سے اتنی دور کھینچ لائی تھی۔ وہ ایک کم سن دوشیزہ تھی۔ اور عام دوشیزہ لڑکیوں کیطرح اس میں بھی خوف کا مادہ کافی درجہ تک موجود تھا۔ لیکن اب اپنی بے ساختہ رفتار کے جدو جہاں آکر کھڑی ہوئی تھی وہیں گڑ کر رہ گئی۔ اسکی قوت حرکت سلب ہوگئی۔ موسیقی نے ساری فضا پر اپنا عنکبوتی جال بچھا رکھا تھا۔ اور اس جال میں آکر وہ اسیر ہوگئی تھی۔ مگر یہ اسیری ایک لطف انگیز اسیری تھی۔ یہ حراست ایک ولولہ خیز حراست تھی۔ صفیہ کے دل میں اس سے آزاد ہونے کی ذرہ برابر بھی خواہش نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس پُر پیچ جال میں جتنی مضبوطی سے جکڑی جائے بہتر ہے۔ اس کے اندر ایک نشاط تھا۔ اور نشاط کامل ایک ہنگامہ تھا اور طوفان کیطرح موجزن سارے عالم پر ایک ملکوتیت ایک الوہیت طاری تھی۔ صفیہ مرقع حیرت بنی نغمہ زن کو تاک رہی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بےخبر نغمہ زن کو صفیہ کی مطلق خبر نہ تھی۔ اسکی فرط مسرت سے دمکتی ہوئی آنکھیں فضا کے محیط کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ستار کے ساتھ وہ نہایت دھیمی لیکن سُریلی آواز میں گا رہا تھا۔ دور جاکر اس کی آواز ستار کی آواز میں فنا ہو جاتی تھی۔ اس وجہ سے صفیہ کو پہلے اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ اس نے غور سے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ اس کی تشنہ روح ہر لفظ کو مثل سوختہ جذب کرتی گئی ؎

؎ اے کہ بر ما از خطِ مشکیں نقاب انداختی ٭ لطف کردی سایۂ بر آفتاب انداختی
گنج عشق خود نہادی در دلِ ویرانہ من ٭ سایۂ دولت بریں کنجِ خراب انداختی

صفیہ عالم گم شدگی میں جس قدر کان دھر کر سنتی گئی۔ اتنی ہی شدید طور پر اشعار کے مخفی راز ان کے پوشیدہ نکات اس پر کھلتے گئے۔ ابھی تک اس نے ایک نہایت غیر شاعرانہ زندگی بسر کی تھی۔ بچپن ہی سے اسے ... میں مطالعہ کا شوق تھا علم ادب سے اسے خاص رغبت تھی۔ لیکن وہ ہر کتاب کو حتیٰ کہ شکسپیر "...

حافظ

حافظ، انوری، کے انسانی جذبات و دلولوں سے چھلکتے ہوئے اشعار کو بھی اپنے خاص نقطۂ نظر سے پڑھتی تھی۔ اور وہ تھا یونیورسٹی کا امتحان اشعار کے اندرونی نکات سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہرایک شاعر کی اس کے پاس دو تین کی لکھی ہوئی متعدد شرحیں تھیں اور اُنہیں میں سے خاص خاص اشعار کے معنی وہ حفظ کرلیتی تھی۔

ابھی تک وہ زندگی کی روحانیت سے مطلق ناآشنا تھی لیکن آج اِس نغمہ ساز نے اپنے الہامی راگ سے صفیہ کے قلعۂ دل کی مضبوط دیواروں کو منہدم کردیا۔ اُن کے اندر صد ہا مخفی راز ستار کے تاروں کے ساتھ حرکت کرنے لگے۔ اس کے احساساتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے۔ آگ جو فطرت نے اُس کے اندر دبا رکھی تھی شعلہ زن ہوگئی۔ محبت کا دریا جو اب تک زیرِ زمین بہہ رہا تھا اُبل پڑا۔

ستار کی دِلآویزی اِس طلسم کی کلید تھی جس کے اندر یہ احساسات حالتِ افسردگی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں ایک میٹھا میٹھا درد اُٹھنے لگا۔ جسے اُس نے کبھی پہلے محسوس نہ کیا تھا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اجنبی کے اندر اُسے محبت کا پیغامبر دکھائی دینے لگا۔ اور بے اختیار اس کے دل میں آیا۔ کہ اس کے آگے جاکر اپنے اُٹھتے ہوئے جذبات کے طوفان کو عُریاں کردے۔ اپنی نوآفریدہ محبت کی طغیانی میں اُس اجنبی کو غرق کردے۔

دنیا کی ہر چیز اُسے اِس ظالم کے آگے ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں کھولے ہوئے وہ عالمِ خواب میں تھی۔ وہ پھر آگے بڑھی یہاں تک کہ اجنبی کے بالکل قریب جا پہونچی۔ وہ اب بھی اپنے گانے میں مست تھا۔ اور اُس وقت چونکا جبکہ نازک اور کانپتا ہوا ہاتھ اُس کے شانے پر تھا۔

مُغنی اس غیر متوقع خلل سے سرتاپا لرز گیا۔ چند ساعت وہ دیوانہ وار نیم بیہوشی کے عالم میں بےحس وحرکت کھڑا رہا۔ پھر عقلِ سلیم کے منتشر شیرازوں کو یکجا کرکے واقعات پر غور کرنے لگا۔ صفیہ کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ چار پانچ قدم اپنی جگہ سے دُور لڑکھڑاتا ہوا گیا۔ اور اپنی آنکھیں جن میں چاند کی پوری روشنی تحلیل ہوکر سرایت کرگئی تھی۔ صفیہ کی نظروں میں گاڑ دیں۔

صفیہ اب سنبھل چکی تھی۔ اُسنے نغمہ زن کو غور سے دیکھا۔ مگر دیکھتے ہی سہم گئی۔ اُن روشن آنکھوں کی تاب وہ نہ لاسکی۔ اُسے احساس ہوچلا۔ کہ یہ شخص سطحی ہرگز نہیں ہوسکتا۔ انسانی محبت سے جن نفسیات کا زیادہ

حصہ مشتمل رہتا ہے۔ یہ مُبّرا ہے۔ اس کے پَر بلند پرواز ی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اپنے ستار اور موسیقی کی قوت سے عشقِ حقیقی کا طالب ہے عشق جو عبد و معبود میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔ اور جس کی آخری منزل من تو شدم تو من شدی ہے۔

صفیہ خوابِ بیداری سے چونک پڑی۔ نغمہ زن جاچکا تھا۔

وہ امتحان میں شریک ہوئی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔

اب کبھی کبھی جب صفیہ بستر پر لیٹتی ہے۔ اور آنکھیں بند کرکے سو جانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ تو رات کے سناٹے میں ستار پر کوئی گاتا سنائی دیتا ہے ؎

گنجِ عشقِ خود نہادی در دلِ ویرانہ من　　　سایۂ دولت بریں کنجِ خراب انداختی

صفیہ چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ تو نغمہ بند ہو جاتا ہے۔

وہ ایک آہ سرد بھرتی ہے۔ "نہیں یہ وہم ہے اب وہ نہ آئے گا"

دلچسپ مُفید معلومات

(مرسلہ مولانا راغب حسن صاحب ناظم مسلم لائبریری کرنال)

مولانا موصوف نے باوجود مصروفیت کے ہماری درخواست پر یہ "مفید معلومات" کے سلسلہ کی پہلی قسط عنایت فرمائی ہے جس کو ہم شکریہ کیساتھ شائع کر رہے ہیں مولانا کی نوازشات سے امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا (ادارہ)

کوئی رقم ۱۱ پونڈ ۱۹ شلنگ ۸ پنس سے کم لو جس میں پنس کی تعداد پونڈ سے کم ہو۔ اسکو اُلٹا لکھ کر اصل رقم میں سے گھٹاؤ۔ پھر حاصل تفریق کو اُلٹا لکھ کر حاصل میں جمع کر دو۔ وہ جواب ہمیشہ ۱۲ پونڈ ۹ شلنگ ۱۱ پنس ہوگا۔

اگر کسی نے کچا پارہ کھالیا ہو۔ تو پہلے ایک بار دو گلاس دودھ پلا دو۔ پھر چند کچے انڈے کھلا دو۔ یہ اشیاء پارہ سے مل کر ایک البانمک تیار کرتی ہیں۔ جس سے پارہ معدہ میں ہضم نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ عمل جلد کرنا چاہیئے۔ اور معدہ کی صفائی اچھی طرح کر لی جائے۔

ٹرکی میں پگڑی کے بجائے ترکی ٹوپی (طربوش) اور یورپین لباس کا رواج سلطان محمود ثانی مصلح کے عہد میں جبکہ اُس نے افواج ینگچری کو تباہ کرکے جدید نظام کی فوج قائم کی شروع ہوا تھا۔ ینگچری افواج کو ۱۵ جون ۱۸۲۶ء کو قسطنطنیہ میں ان کی سرکشی کی وجہ سے توپوں سے مقابلہ کرکے ہلاک کیا گیا تھا۔

ٹرکی ٹوپی کے بجائے یورپین ہیٹ کا استعمال بطور قومی ٹوپی کے مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) مرحوم نے رائج کیا۔

تہذیب مغرب:۔ نیس جو فرانس میں ساحل او قیانوس پر ایک خوبصورت شہر ہے اُس سے چند میل کے فاصلہ پر لب سمندر پہاڑیوں کے دامن میں ایک اور چھوٹی سی خوبصورت بستی "مانٹی کارلو" ہے۔ جو مصداق ؎ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست۔ دنیا بھر کے بیفکروں اور عیش پرستوں کا مجمع بنی رہتی ہے۔ یہاں کی میونسپلٹی نے بڑے سرمایہ سے ایک قمار خانہ قائم کیا ہے جس کی آمدنی سے میونسپلٹی کا کاروبار چلتا ہے۔ دس بجے دن سے آدھی رات تک دنیا بھر کے قمار باز یہاں جوا کھیلتے ہیں۔ اور ہر روز متعدد لکھ پتی مفلس اور کئی محتاج لکھ پتی بن جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اکثر خودکشی کے معمولی واقعات بھی یہاں رونما ہو جاتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں اس نیا ہی کے زمانے میں بھی یہ مہذب مشغلے جاری ہیں یا نہیں۔

خالص کلورا فارم دانتوں پر لگانا درد کیلئے مفید ہے ۔

ترجمہ چٹھی

نمبری 1546 مورخہ 16 نومبر ۱۹۴۱ء منجانب نوابزادہ محمد ممتاز علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کرنال بنام جناب پنڈت گوپال کرشن صاحب ایم ۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال ۔

" میں آپ کا اور آپ کے سکاؤٹس کا اُن خدمات کے لئے جو کہ انہوں نے میلہ شاہ قلندر صاحب کے موقعہ پر سرانجام دیں ۔ تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ انہوں نے میلہ کے انتظام میں نہایت اطمینان بخش مدد فرمائی ۔

آپ از راہ نوازش میرا یہ پیغام اُن کو اور ٹروپ انچارج کو پہنچا دیں ۔ اور میری طرف سے شکریہ ادا کر دیں ۔

سر کچھ

میرے اظہار ندامت کی اگر شرم ہے کچھ

اپنے دامن میں چھپا لے تری رحمت مجھکو

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۵۱۸

مٹ گئیں خود داری میں وہ قومیں آخر
مائل تجدید ہے جن کا نظام زندگی

گورنمنٹ نارمل سکول کرنال کا ماہوار رسالہ

بظل حمایت

عالیجناب بابا(?) عبد الحمید خانصاحب ایم اے بی ٹی ای ایس انسپکٹر مدارس انبالہ ڈویژن

تجدید التعلیم

جلد ۳

نمبر ۸

نگران

خان صدر الدین خاں بی اے بی ٹی پی ای ایس ہیڈ ماسٹر

مدیر اعزازی
(حافظ) محمد رضوان اللہ
فاضل ادب، مولوی فاضل
ادیب فاضل

مدیر مسئول
پنڈت گوپال کرشن ایم اے

مینیجر
مولوی محمد منیر
(منشی فاضل)

قیمت فی پرچہ
چھ آنہ

سالانہ چندہ
(عہ) تین روپے

منظور کردہ صاحب ڈائرکٹر بہادر تعلیمات پنجاب بروئے چٹھی نمبر ۷/ ۲۰۶۲۳ مورخہ ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۹ سنہ عیسوی

قواعد تجدید التعلیم

۱- پرچہ ہر ماہ ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر پرچہ نہ پہنچے۔ تو تاریخ اشاعت سے دس روز کے اندر اطلاع دینے پر دوسرا پرچہ مفت بھیجدیا جائیگا۔ بعد میں مانگیں تو چھ آنے قیمت لی جائے گی۔

۲۔ صرف اُن جواب طلب خطوط کا جواب دیا جائیگا۔ جن کے ساتھ جوابی کارڈ یا سوا آنہ کا ٹکٹ ہوگا۔

۳۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت بنام "ہیڈ ماسٹر نارمل سکول کرنال" کی جائے۔ اور ہر دفعہ لکھنے پر اپنا پورا پتہ لکھیں۔ نیز منی آرڈر کے کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر کریں۔

۴۔ کوئی فرقہ وارانہ، سیاسی یا دلآزار مضمون ہرگز شائع نہ ہوگا۔

۵۔ تمام مضمون نگار اپنے مضمون مختصر اور صاف لکھ کر سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑ کر اور کاغذ کے ایک طرف تحریر کرکے بھیجا کریں۔ مضمون لکھتے وقت فضول عبارت آرائی سے پرہیز کیا جائے۔ صرف دلچسپ اور مفید مضامین شائع ہوسکیں گے۔

۶۔ نظموں کے بھیجنے میں خاص احتیاط سے کام لیں۔ جب تک نظم فن کے لحاظ سے درست، بندش کے لحاظ سے چست اور مضمون کے اعتبار سے مفید نہ ہوگی۔ اُس وقت تک ہرگز شائع نہ ہوسکیگی۔

۷۔ رسالہ کی قیمت تین روپے سالانہ اور ضخامت ۴۴ صفحہ ماہوار ہے تعلیم بالغان کے ۱۲ صفحے کے ضمیمہ کی قیمت جو ماہوار نکلتا ہے۔ ایک روپیہ سالانہ علیحدہ ہے۔

گوپال کرشن ایم۔ اے

پنڈت گوپال کرشن ایم۔ اے نے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس نمبر۱ ایبٹ روڈ لاہور میں چھپوا کر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال سے شائع کیا

فہرست مضامین تجدید التعلیم

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

"سخنہائے گفتنی"

(از جناب ماسٹر نذیر احمد صاحب آثم ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال)

ناظرین تجدید التعلیم کیلئے یہ خبر یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، کہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء سے مدرسہ ہذا کی باگ ڈور جناب خان صدر الدین خانصاحب بی۔اے۔ بی۔ٹی۔ پی۔ای۔ایس جیسی بیدار مغز اور با تدبیر ہستی کے ہاتھوں میں آگئی ہے خانصاحب موصوف کے تعلیمی تجربات اور تبحر علمی کے متعلق لب کشائی کرنا، آفتاب کو چراغ دکھانے کے مانند ہے۔ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا۔ کہ در حقیقت نارمل سکولوں کیلئے ضرورت بھی ایسے ہی افراد کی ہے جنہوں نے اپنے آپکو درس و تدریس میں اسیطرح مدغم کر دیا ہو۔ کہ اُنکی حرکات و سکنات، رفتار و گفتار اور قول و فعل سراسر تعلیم کے راز سربستہ بن کر رہ گئے ہوں،

اگرچہ خانصاحب موصوف طویل عرصے بیمار رہنے کے بعد، درسگاہ ہذا میں تشریف لائے ہیں، مگر تعلیمی انہماک اور ادبی شغف میں نحافت مانع ہے۔ نہ پیرانہ سالی، علم کی حقیقی چمک اس امر سے بخوبی واضح ہوتی ہے، کہ باوجود ڈاکٹروں کی تاکید کے آپ اگر خود کثرت سے مطالعہ نہیں کر سکتے، تو لمحات فرصت میں دوسرے احباب سے معیاری کتب پڑھوا پڑھوا سنتے رہتے ہیں، اور اس طرح اپنے اس فطرتی شوق کو پورا فرما لیتے ہیں، جو علم و ادب کے لئے جناب کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔

ہم دست بدعا ہیں۔ کہ خداوند قدوس جلد از جلد جناب کی اُس نحافت کو دُور کرے۔ جو طویل علالت کی وجہ سے پیدا ہو چکی ہے۔ اور تا حین حیات تندرست و توانا رکھے۔ آمین۔

۲۔ گذشتہ ماہ کی ۱۰ اور ۱۱ اور ۱۲ کو جناب لالہ لچھمنداس صاحب پی۔ای۔ایس ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز برائے رورل سائنس پنجاب نے نارمل سکول کرنال کو اپنی تشریف آوری کا افتخار بخشا جناب نے اپنے دوران قیام میں ضلع کرنال کے سکولوں سے متعلق زراعتی فارموں کا معائنہ فرمانے کے علاوہ گورنمنٹ نارمل سکول کے اساتذہ و طلبار کی واقفیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے کیر ٹے

کی

کی سوانح حیات" اور "پودے کی زندگی" جیسے دلچسپ عنوانات پر نہایت مبسوط تقاریر فرمائیں۔ آپ نے اپنی پُراز معلومات اور بصیرت افروز تقاریر میں بعض ایسے اہم امور کا انکشاف کیا جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی تھے، اپنے گراں بہا ارشادات کے بعد جناب نے اکثر وبیشتر سوالات کے جوابات بھی نہایت خندہ پیشانی سے۔ بکرہ سامعین کو مطمئن فرمایا ہم درسگاہ ہذا اور ادارہ کی جانب سے آں محترم کو اپنا حقیر ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

۳۔ اب ہم ناظرین کی توجہ کا انعطاف مجلس عزا کی جانب کرتے ہیں، اِس دنیا کو اگر مجموعۂ اضداد سے تعبیر کیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس میں کہیں نوبت ونقارے بجتے ہیں۔ اور کہیں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اسی دو رنگی کے پیش نظر

یہ امر افسوس کیساتھ تحریر کیا جاتا ہے۔ کہ پچھلے مہینے محکمہ تعلیم کے ایک پرانے خدمتگذار لالہ سیتا رام صاحب بی۔ اے ایس ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو کوچ فرما گئے۔ ہمیں مرحوم کے پس ماندگان خصوصاً لالہ رام لعل صاحب ایڈووکیٹ کرنال کیساتھ اِس جانکاہ واقعہ میں پوری پوری ہمدردی ہے۔

۴۔ اس کیساتھ ہی ہم جناب محترم لالہ دینا ناتھ صاحب سٹینو گرافر انسپکٹر آف سکولز قسمت انبالہ کی زوجہ محترمہ کی اندوہ ناک وفات حسرت آیات پر اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں، کہ آں جہانی کو پرماتما سُرگ میں جگہ دے۔ اور اُن کے اعزا واحبا کو صبر اور شانتی عطا فرمائے۔

۵۔ اخیر میں ہم تمام اساتذۂ سکول اور عملۂ تجدید التعلیم کی جانب سے اپنے مخدوم ومحترم جناب حافظ مولانا رضوان اللہ صاحب عباسی مدیر اعزازی کو بھی اُن کے خسر مکرم جناب حکیم اختر حسین صاحب عثمانی الجلالی کی بے وقت موت پر پُرسہ دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں، اور بارگاہِ ربِ ذوالمنن میں خلوص دل سے ملتجی ہیں، کہ وہ حکیم صاحب موصوف کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور اُن کے اقربا ومتعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ فقط۔

کس قیامت کا ہے اُن کا رعبِ حُسن
عرصۂ محشر میں عالم ہُو کا ہے

دُعا بدرگاہ قاضی الحاجات

جناب کریم بخش صاحب جوش ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول کرنال

افسوس صد افسوس۔ دنیا اپنے اس معبودِ حقیقی اور بے نظیر داتا کے نام کو چھوڑ بیٹھی۔ جس نے سورج بنایا۔ چاند بنایا۔ دریا بہائے۔ پہاڑ بنائے۔ آگ دی۔ پانی دیا۔ ماں باپ دیئے۔ بہن بھائی دیئے۔ دو آنکھیں دیں۔ دو ہاتھ دیئے۔ منہ دیا۔ کان دیئے، اناج دیا۔ پھل دیئے۔

نہ معلوم ہم کیوں بھٹکے پھرتے ہیں۔ اور ہماری عقلوں پر کیوں پردہ پڑ گیا ہے، کیا انسانی زندگی کا یہی مقصد تھا؟

اے دو جہاں کے مالک، بادشاہ اور فقیر کے رزاق، انسان اور حیوان کے داتا، بوڑھے اور جوان کے مالک، کیڑوں اور مکوڑوں کے والی، چرند اور پرند کے محافظ، محتاجوں کے آقا، امیروں کے داتا، حیوانات کے بادشاہ، اور نباتات کے بادشاہ، بھوکوں کو کھانا کھلانے والے، گم کردہ راہ کو راستہ بتانے والے، چرند کو روزی دینے والے؛ پرند کو دانا کھلانے والے، مظلوموں کی آہ سننے والے، یتیموں کی فریاد سننے والے، ڈوبتے کو تیرانے والے، مردہ کو زندہ کرنے والے، اندھوں کی خبر لینے والے، محتاجوں کی سننے والے، سمندروں کے حاکم، پہاڑوں کے شہنشاہ، جنگلوں کے خداوند، بیابانوں کے بادشاہ، تیرا یہ ایک ناچیز اور گنہگار بندہ حقیر پُر تقصیر غلام تیری بے نیاز سرکار میں، ترے سچے دربار میں، تیری بخشش کی سرکار میں، تیری ہی رحمت کے دربار میں، بے سر و سامان دست بدعا حاضر ہے،

اس کی طرف توجہ، اس کی طرف خیال، کر نگاہِ لطف اس کی طرف، کر نظرِ شفقت اس کی جانب اس کی بات سن، اس کی فریاد سن، اس کی التجا سن، اس کی عرض سن،

یہ تنگ ہے دُنیا سے، بیزار ہے یہاں سے، پیاسا ہے، بھوکا ہے، غریب ہے، محتاج ہے، مظلوم ہے بیکس ہے، مفلس ہے، نادار ہے،

پتھر میں کیڑے کو روزی پہنچانے والے، تیرا کرم بڑا، تیرا رحم بڑا، تیری قدرت بڑی، تری شفقت بڑی، لے اِسے اپنی آغوشِ محبت میں لے،

کر اِس کا خوف دُور، اِس کا ڈر دُور، اس پر رحم، اِس پر کرم، اِس پر شفقت، اِس پر رحمت اور اس کی دلی تمنائیں پوری،

اندھیری رات بنانے والے، چاندنی رات کرنے والے، سورج بنانے والے، چاند گھڑنے والے، آگ بخشنے والے، پانی عطا کرنے والے، دُکھ دینے والے، سُکھ بخشنے والے، اولاد دینے والے، دولت بخشنے والے، عزت سے سرفراز کرنے والے، ذلت میں ڈالنے والے، تو لازوال ہے، بے مثال ہے، بے نیاز ہے، بے نظیر ہے، رزاق ہے، برحق ہے، واحد ہے، احد ہے، دے اے مالک دے بے اولادوں کو اولاد اندھوں کو آنکھیں، لنگڑوں کو ٹانگیں، بے گھروں کو گھر، بے زروں کو زر، بے صبروں کو صبر، ناشکروں کو شکر، اور قیدیوں کو رہائی۔

دُور کر مالک دُور کر بھوکوں کی بھوک، پیاسوں کی پیاس، عیاروں کی عیاری، سفاکوں کی سفاکی، فکر والوں کی فکر، قرضداروں کا قرض، مغروروں کا غرور، یتیموں کی آہیں، اور بینواؤں کے نالے،

پوری کر خالق پوری کر، حاجتمندوں کی حاجتیں، نیکوں کے نیک ارادے، مفلسوں کی التجائیں، بادشاہوں کی خواہشیں، ہدایت دے ہمیں نیک کاموں کی، بھائیوں کی ہمدردی کی، راہ نیک کی، حلال کی کمائی کی، شرم کی، حیا کی، حلم کی، ادب کی، برقرار رہے ایمان کی،

عطا کر مالک عطا کر، اپنی اُلفت، استاد کی رحمت، ماں باپ کی محبّت، بہن بھائی کی شفقت بیوی کی راحت، اولاد کی مسرت،

خوشی نصیب کر رحیم خوشی میری روح کو، میرے دل کو، میری ماں کو، میرے باپ کو، میری بہنوں کو، میرے بھائیوں کو، آمین، آمین، ثم آمین

عِلم

جناب حکیم نور احمد صاحب گلچیں سابق مدیر "آفتاب مشرق" کرنال۔

شکر ادا ہو نہیں سکتا کبھی تیرا اے علم! نوعِ انساں پہ کئے جس قدر احساں تُو نے!
"سختیٔ کار" سے انساں کو دلائی ہے نجات جس قدر کام تھے مشکل کئے آساں تُو نے!
ریگزاروں کو جہاں آگ برستی تھی سدا فیض سے اپنے کیا رشکِ خیاباں تُو نے!
ظلمتِ جہل سے تاریک جہاں تھا لیکن نور سے اپنے کیا "جلوہ بداماں" تُو نے!
جا سکی تھی نہ جہاں تک کبھی سورج کی کرن جلوہ گر کر دی وہاں "برقِ درخشاں" تُو نے!
چیر ڈالے ہیں زمینوں کے جگر آلوں سے آسمانوں کو کیا "تابعِ فرماں" تُو نے!
زیرِ آب اپنے چلائے ہیں سفینے اکثر اور ہواؤں پہ کھلائے ہیں گلستاں تُو نے!

تیری شرمندۂ الطاف ہے دُنیا اے علم
تو ہے آسائشِ گیتی کا سہارا اے علم

کارنامے جو بیاں ہوں ترے ممکن ہی نہیں کہ بنایا ہے عجب دہر کا نقشہ تُو نے!
بن گئی خاک ترے "فیضِ نظر" سے اکسیر ذرّہ کو ہمسرِ خورشید بنایا تُو نے!
موشگافی کا نظر کو ہے سلیقہ بخشا عقل کو "نکتۂ ایجاد" سکھایا تُو نے!
کر لیا تُو نے ہواؤں کو بھی یکسر محکوم اور فضاؤں پہ ہے رنگ اپنا جما یا تُو نے!
تھی یہ دُنیا کبھی "معمورۂ ویراں" لیکن رشکِ صد گلشنِ فردوس بنایا تُو نے!
گمرہوں نے رہِ حق پائی مدد سے تیری یعنی بندوں کو خدا سے ہے ملایا تُو نے!
برکتیں ہیں تری آفاق میں جاری ہر سُو جو نہ دیکھا تھا کسی نے وہ دکھایا تُو نے!

تُو! وہ ہے جس کو ترا شوق میسّر ہو جائے
سب سے مُنہ موڑ کے تیرا ہی وہ یکسر ہو جائے

ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

از جناب پروفیسر آل احمد صاحب سرور ایم۔اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

پچھلی اشاعت میں ہمارے محترم مضمون نگار (حکیم نور احمد صاحب گلچیں) نے زیر عنوان "مولانا حالی و تسلیم کی شاعری میں قنوطیت اور رجائیت" کا فرق لطیف ظاہر کیا تھا۔ زیر نظر مقالہ سے حالی کی جامعانہ اور ناقدانہ حیثیت کو اُردو ادب میں جو درجہ حاصل ہے۔ وہ ہمارے ناظرین کرام ملاحظہ فرمائینگے (ادارہ)

اُردو ادب میں حالی کا کیا درجہ ہے۔ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے، حالی کے کارنامے بہت ہیں۔ اُن کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے، وہ شاعر بھی ہیں۔ اور نثار بھی۔ نقاد بھی۔ اور صاحب طرز بھی۔ وہ صرف مسدس ہی کے شاعر نہیں۔ اُنہوں نے اور بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ وہ غزل کے خلاف ہیں لیکن اُن کی بہت سی غزلیں اُردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پاسکتی ہیں۔ ان غزلوں میں ہجر اور وصل بھی ہے، اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی۔ مگر صرف یہ ہی نہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اُن کی نظموں اور رُباعیوں میں اخلاقی تعلیم اور اصلاحی پیغام ہے، مگر تاثیر اور شیرینی بھی کم نہیں۔ وہ واعظ بھی ہیں، اور مُصلح بھی، ناصح بھی، حکیم بھی، مگر دراصل وہ شاعر ہیں۔ اسے غالب نے بھی تسلیم کیا تھا۔ اور آج بھی ہر صاحب فہم مانتا ہے، نثر میں اُن کے کارنامے کچھ کم روشن نہیں۔ وہ تین بلند پایہ کتابوں کے مُصنف ہیں۔ جو اُردو ادب میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ 'حیات سعدی'، 'یادگار غالب' اور 'حیات جاوید' سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ ان کے علاوہ حالی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں، اپنی نظموں پر دیباچے اور اپنے دیوان پر مقدمے تحریر کئے ہیں۔ تقریریں کی ہیں، مقالے پڑھے ہیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے ہیں۔ اور آج یہ سب چیزیں ارباب نظر کی آنکھ کا

سرمہ ہیں۔ انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی، شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور حیات آفریں نظریہ مرتب کیا۔ پھر اس نظریہ کی روشنی میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا، اور اردو غزل قصیدہ، مرثیہ، مثنوی پر علیحدہ علیحدہ ناقدانہ نظر ڈالی، ہماری تنقید کے جو سانچے ہیں وہ حالی کے بنائے ہوئے ہیں، ہم جن چیزوں پر آج زور دیتے ہیں۔ اُن کی طرف سب سے پہلے حالی نے اپنے مقدمہ میں توجہ دلائی تھی۔ انہوں نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اُن کے جتنے رفیق اور ہمعصر تھے سب صاحب طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی۔ باقی یا تو ختم ہو گئے، یا اُن کی کار فرمائی محدود ہو گئی، آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زور بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی، سب اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن آج نثر کا رجحان کیا ہے؟ یہ بتانے کی ضرورت ہے، حالی نے ہوش سنبھالا، تو ہمارا ادب ایک خاص جگہ پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ شاعری چونکہ آزاد کے الفاظ میں "فارسی کے پروں سے اُڑتی تھی"۔ اس لئے اُس میں ویسی ہی باتیں آگئیں تھیں۔ جس ماں کا اُس نے دودھ پیا تھا۔ اُس کی خاصیت پیدا ہو چلی تھی، روشنی تھی گرمی نہ تھی، حسن تھا تندرستی نہ تھی۔ بلند آہنگ نغمے تھے، مگر اُن میں تاثیر ناپید، نقالی عام تھی، ایجاد کو پسند کرنے والے کم تھے، ذوق غالب سے بہتر سمجھے جاتے تھے، محاورہ کی خاطر شعر کہا جاتا تھا۔ شاعری صرف غزل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، نثر اگرچہ نظم سے کم عمر تھی، مگر اُس میں صحیح و صالح رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ سرسید کی ابتدائی تصانیف اور غالب کے خطوط میں عام رنگ کے خلاف صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی تھی۔ حالی غالب کے معتقد اور میر کے مقلد اور شیفتہ سے مستفید تھے، غالب کی شاعری سے متاثر نہ ہوئے۔ ان کی نثر سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے مسدس سے پہلے جو کچھ لکھا۔ اُس کی اہمیت عام طور پر نظر انداز کی جاتی ہے۔ غالب اور شیفتہ کی صحبت، عرب شعرار کا مطالعہ اور خود شاعر کی سادگی اور دردمندی ان سب باتوں کی وجہ سے حالی کی غزلوں میں بھی بہت نشتر موجود ہیں۔ اُن کی جوانی داغ و مومن کیطرح دیوانی نہ تھی، مگر اس میں جوانی کی ساری اُمنگ اور ترنگ موجود ہے، اُس کی غزلوں کے چند شعر دیکھئے۔ اُن میں سادگی ہے

مگر حسن اور شیرینی بھی۔ الفاظ دھیمے ہیں، مگر وہ کسک اور کھٹک ہے۔ جو نشتر میں ہوتی ہے۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں سے ٭ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم ٭ آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں ٭ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت ٭ ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت ٭ کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
تعزیر جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ٭ بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اور جو لوگ انہیں صرف رونے اور بسورنے والا شاعر سمجھتے ہیں۔ وہ ذرا یہ اشعار سنیں:-

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت ٭ اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت ٭ واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
ہے جہاں راہزن و راہ نما ایک ہی شخص ٭ قافلے گزریں وہاں کیونکر سلامت واعظ
کل خزاں آکے بتادے گی وطن کس کا ہے ٭ کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے

غرض حالی نے جب لاہور کے مشاعروں میں نیچرل اور حبِ وطن کا راگ گایا۔ تو اس وجہ سے نہیں۔ کہ انہیں غزل کہنا نہ آتی تھی۔ اور نہ اس وجہ سے کہ وہ غزل سے بیزار تھے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری کو صرف غزل نہیں بنانا چاہتے تھے۔ بلکہ اُسے اتنا وسیع کرنا چاہتے تھے۔ کہ وہ آفاقی ہو جائے۔ وہ بعد میں بھی غزلیں لکھتے رہے، اور ان سے وہ تمام کام لیتے رہے، جو نظموں سے لیتے تھے، لیکن ان کی توجہ نظم پر ہی رہی۔ نیچرل اور حبِ وطن سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے نظیر اکبرآبادی بھی اسے الاپ چکے تھے، مگر ان کی آواز کسی نے نہ سنی تھی، حالی نے جب یہ نغمہ چھیڑا۔ تو اس کا اثر ہوا۔ اور ان کی اور آزاد کی کوششوں سے مقامی رنگ

نظر نگاری وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنی بہار دکھلانے لگے۔ لاہور سے واپسی پر سرسید سے ملاقات ہوئی۔ اور بہت جلد سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے۔ مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اور سرسید اُسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی پستی سے نجات ملی، یہ نظم اپنے طرز کی انوکھی اور نئی ہے، اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے۔ اس میں حالی نے اپنی قوم کا مرثیہ لکھا ہے، مگر مرثیہ میں تعمیری شان ہے، جہاں اس میں شرفاء کی حالت، شعراء کی پستی۔ علم و عمل کے فقدان پر ماتم ہے، وہاں ماضی کی شان و شوکت کا وہ ولولہ انگیز تذکرہ ہے، جسے پڑھ کر مایوس سے مایوس دل بھی گرما جاتا ہے، مسدس میں کئی مقامات ایسے ہیں۔ جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ عرب کی جہالت اسلام سے پہلے نبی برحق کا نزول، اُنکی سیرت ان کی تعلیم اُن کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبہ الہامی، مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری، قرطبہ اور بغداد کی عظمت سب کا ذکر سادہ مگر بڑے پُر اثر الفاظ میں ہوا ہے۔ حالی خود روتے ہیں۔ اور اوروں کو رُلاتے ہیں۔ پھر ایسی باتیں کہتے ہیں۔ کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ مگر دلوں میں خاموش عزم بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ ماضی کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ مگر ماضی کی یاد میں کھو جانا۔ ان کا شیوہ نہیں۔ ماضی کی ہر تصویر وہ عبرت کیلئے پیش کرتے ہیں۔ نہ عشرت کے لئے۔ مسدس کے بعد حالی نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ اُن میں سے شکوہ ہند۔ مناجات بیوہ اور چپ کی داد زیادہ مشہور ہیں۔ حالی کی شاعری کا مقصد اب قوم کو خیال بندی اور خیال آرائی کی دنیا سے نکال کر حال کی دنیا میں لانا تھا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ شاعر کا مقصد کیا ہے، اور اُسے کیا کرنا چاہیئے، چنانچہ انہوں نے جہاں کہیں پستی اور جہالت دیکھی، تو قوم کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً چپ کی داد میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور اہمیت کو جو قدامت اور رواج پر قربان ہو چکی تھیں، پھر زندہ کیا، اس نظم کا آغاز کس قدر غیر شاعرانہ ہے، مگر آگے چل کر شاعری کی دیوی سارے

مصنوعی

مصنوعی زیور اُتار کر صرف اپنی معصومیت اور سادگی میں جلوہ گر ہوتی ہے، بقول فراق کے ان کے سکوت میں بہریں ہیں۔ اور لہروں میں سکوت مناجات بیوہ میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی بے مثل انداز میں کیگئی ہے۔ زبان وہ ہے، جو شہری اور دیہاتی، امیر، غریب، عالم اور عامی سب سمجھیں انداز وہ ہے۔ کہ ہر لفظ دل میں بیٹھتا چلا جائے۔ لہجہ وہ ہے۔ جو کہیں ناصحانہ نہیں ہونے پاتا۔ حالانکہ اس میں حالی دنیا کی محبت کو خدا کی محبت میں محو کرنے کی تلقین کرتے ہیں، چند شعر سنئے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

ریت کی دیوار ہے دُنیا ⁂ اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا ⁂ ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے ⁂ اس نگری کی ریت یہی ہے
آئیں بہت دنیا میں بہاریں ⁂ عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں ⁂ برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی ⁂ وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

اسی کے متعلق مولوی عبدالحق نے بہاتما گاندھی سے کہا تھا، "اگر اس بدقسمت ملک کی ایک زبان ہوئی۔ تو وہ مناجات بیوہ کی زبان ہوگی۔ حالی کی رُباعیات میں ناصحانہ انداز کہیں کہیں زیادہ ہے، لیکن کام کی بات ضرور بیان کی گئی، نثر میں جو کتابیں حالی نے لکھی ہیں، وہ پہلے سوانح نگاری پھر تنقید کے ماتحت آتی ہیں، حیات سعدی اور یادگار غالب دونوں میں سوانح بھی ہیں اور تنقید بھی، حیات جاوید جو سب سے بعد کی اور سب سے زیادہ مکمل ہے۔ صرف سوانح سے متعلق ہے، زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالی کبھی بہت زیادہ زور نہیں دیتے۔ تینوں کتابوں میں بہت کم صفحے حالات کی نذر کیئے گئے ہیں، اُن کی زیادہ توجہ شخصیت اور اُس کے کارنامے نمایاں کرنے پر

رہتی ہے، حیاتِ سعدی کے علاوہ باقی دو کتابیں معاصرین سے متعلق ہیں۔ ایسے معاصرین جو اُنیسویں صدی کے سب سے نمایاں افراد کہے جا سکتے ہیں، حالی کو جو مواقع اِن دونوں کی رفاقت سے حاصل تھے، اُن سے انہوں نے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ غالب کے حالات سرسری طور پر بیان کئے گئے ہیں، چار سو صفحوں کی کتاب میں سے ۹۶ صفحے سوانح کی نظر کئے ہیں، اُن میں سے بہت سے لطائف وظرائف شیفتہ اور میر کے حالات اور غالب کے اشعار ہیں، مگر دوسرے حصہ میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ غالب کی شاعری اپنے زمانے میں خواص ہی میں مقبول رہی، عوام تک اُسے پہنچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں یادگار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اُن کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے۔ وہ نہ بجنوری کیطرح غالب کو الہامی درجہ دیتے ہیں۔ نہ لطیف کیطرح اُن پر غیر ہم آہنگی کا الزام لگاتے ہیں، انہوں نے غالب کی جو خصوصیات گنائی ہیں۔ وہ سب اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے، کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے۔ انہوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح کر کے غالب کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور فارسی کے بعض شعراء سے اُن کا موازنہ ایک طرفہ نہیں۔ بلکہ انصاف پر مبنی ہے، اُن کی یہ رائے کہ خسروؔ اور فیضی کے بعد مرزا کی لٹریری قابلیت اور جامع صفات کا آدمی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ بڑی حد تک صحیح ہے، غالب کی مقبولیت کا...... ایک سبب یہ ہے، کہ انہیں حالی جیسا سوانح نگار اور نقاد ملا۔ مگر حیاتِ جاوید ان دونوں کتابوں سے زیادہ اہم ہے، اس میں صرف سرسید کی نہیں، بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آ گئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا۔ بالکل صحیح ہے، اور انہوں نے سرسید کی مذہبی خدمات پر غضب طور پر زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے، جس کے بغیر

سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا، حالی کے ہاں وہ چیز ہے اس وجہ سے ان کی کتاب کو مدلل مداحی کتاب المناقب اور ایک رُخی تصویر کہا گیا ہے، مگر اس قسم کے اعتراضات تو باسول کی کتاب لائف آف جانسن پر بھی کئے گئے ہیں۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے۔ حیات جاوید اتنی مقبول نہیں ہوئی، جتنی یادگار غالب اِس کی وجہ یہ ہے، کہ غالب کی شخصیت سر سید سے زیادہ دلچسپ ہے، مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے شعر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، وہ خود اُن کی شاعری میں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔ سادگی، اصلیت اور جوش ان تینوں کی ضرورت حالی نے بڑے دل نشین انداز سے سمجھائی ہے، پھر اس معیار پر انہوں نے اردو شاعری کو پرکھا ہے۔ غزل کے خلاف انہوں نے بڑے بڑے اعتراضات کئے ہیں، گر دراصل اُن کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر ہے، جس نے شاعری کو غزل میں غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا، انہوں نے قدما کی اس وجہ سے تعریف کی ہے۔ کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں، بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔ قصیدہ میں چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کو ترقی ہوتی ہے، جن کی وجہ سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے، اس لئے حالی اس کی مذمت کرتے ہیں، اور مرثیہ اور مثنوی نے چونکہ اردو شاعری میں رزمیہ بزمیہ دونوں رنگ پیدا کئے اس لئے اُسے سراہتے ہیں، غرض وہ شاعری کو شخصی و صنعتی کھوج سے نکال کر زندگی سے قریب لانا چاہتے ہیں۔ اُن کی تنقید سے رہنمائی اور اصلاح دونوں کام انجام پاتے ہیں، وہ اس میکدہ میں جہاں شراب کا دَور ختم ہو چکا تھا، مگر ہائے ہو جاری تھی۔ جاکر ہوشیاری کا پیغام سناتے ہیں، آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں، بلکہ اخلاق کی خاطر، زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر، اس میں حرکت، بلندی اور عظمت پیدا کرنے کی خاطر چاہتے ہیں، اور اس لئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ جو آسان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ حالی سے پہلے ادب ایک خاص طبقہ کیلئے تھا، اسی طبقہ کیلئے وہ نغمۂ شادی اور نوحہ غم کا سامان بہم پہنچاتا تھا، ہمارے شاعر اور ادیب

یا تو دربار سے وابستہ تھے، یا خانقاہ سے کبھی کبھی دونوں سے آنکھ مچولی بھی ہو جاتی تھی، اس وجہ سے اس میں یا تو جوانی کے چونچلے اور ساز عشرت کے نغمے یا روحانیت اور بے ثباتیٔ دنیا کے مضامین ہوتے تھے، جو جھونپڑوں میں رہتے تھے، وہ ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھتے رہتے، انہیں یہ احساس ہی نہ تھا، کہ جھونپڑے میں محل سے زیادہ سکون، امن اور آزادی میسر ہو سکتی ہے، اسی وجہ سے انداز بیاں ایسا ہوتا جسے محل والے پسند کرتے یا کر سکتے، انیسویں صدی کے آخیر میں غدر کے بعد بساط الٹی، جماعت کا مفہوم وسیع ہوا۔ انفرادیت کے بجائے قومی نقطۂ نظر آیا، اس وقت لکھنے والوں کو یہ خیال ہوا۔ کہ بات اسی زبان میں ہو جو سب سمجھیں۔ جس میں قابلیت کا زور اور انشاپردازی کی شان نہ ہو۔ بلکہ خلوص کی جھلک اور ایک بڑے مقصد کی چاشنی ہو، سرسید کی نثر اور حالی کی شاعری سے یہ مقصد پورا ہوا۔ خیالی طوطا مینا بنانے کی بجائے کام کی بات پر زور دیا گیا۔ فصاحت بلاغت کے فرسودہ اصولوں کی جگہ ادائے مطلب کی ضروریات نے لی، ادب سے زندگی کے مسائل حل کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے کا کام لیا جانے لگا۔ مہدی کا قول ہے۔ کہ اگر سرسید کے بعد کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ وہ بوڑھے حالی ہیں، ادب کا بہت بڑا وصف یہ ہے، کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں، یہ سلاست اور نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی، حالی نے سرسید کے رنگ کو ترقی دی، سرسید کا رنگ بہت مفید ہونے کے باوجود بے رنگ اور سپاٹ تھا، حالی نے اس میں ادبیت پیدا کی، اُن کا سبو مٹی کا ہے مگر اُن کی مٹی میں شمشیر کی تیزی ہے، اور یہ زبان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کیلئے موزوں اور مناسب ہے، آزاد نے بقائے دوام کا دربار آراستہ کرکے نثر میں شاعری کا چٹخارہ پیدا کیا، انکی روح جدید تھی، مگر لباس قدیم جس رنگ کے خلاف وہ بغاوت کرتے تھے، وہ آخری دفعہ خود ان کی تصانیف میں نظر آیا۔ یہ خیالی مضامین اور مرقع نگاری کیلئے موزوں تھا لیکن علمی اور تنقیدی مضامین کیلئے اس میں گنجائش نہ تھی، نذیر احمد کے طرز میں مذاق کا پہلو بہت نمایاں ہے، اور باوجود بہت جاندار، بہت پُر زور اور بہت تندرست ہونیکے محدود ہی

کہانیوں اور لیکچروں میں مزہ دیتا ہے، مذہبی تصانیف میں نظروں سے گر جاتا ہے۔ شبلی نے اپنے ہم عصروں سے بہت کچھ سیکھا، آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی، سرسید کا استدلال، نذیر احمد کا زورِ بیان سب اپنی اپنی جگہ اُن کے ہاں ہیں، مگر یہ رنگ عالمانہ ہے، اس کے قدردان ہمیشہ رہیں گے، بلکہ پڑھے لکھوں میں ہمیشہ مقبول رہیگا، مگر حالی کی سی ہمہ گیری اُسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، حالی اپنے آپ کو باغ کے پھولوں سے نہیں سجاتے، بلکہ اُنکے ہاں وہ رنگینی ہے، جو خونِ جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ اُن کا طرزِ رواں متین اور سنجیدہ ہے۔ اس میں انگریزی کے الفاظ بے ضرورت بھی آگئے ہیں۔ مگر عام طور پر دوسری زبانوں کے الفاظ خصوصاً ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ سے انہوں نے ایک خاص آہنگ پیدا کیا ہے، وہ تازہ ہواؤں سے منہ موڑ کر نہیں بیٹھتے؛ بلکہ اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اُن کے ہاں بھی خامیاں ہیں۔ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر کہیں کہیں اِس قدر نمایاں ہے، کہ شاعری گھبرا کر پناہ مانگنے لگتی ہے، اُن میں وہ والہانہ کیفیت (ABONDON) نہیں جو غنائی شاعروں کی جان ہے وہ تحیر (SENSE OF WONDER) نہیں۔ جو جگر کی بعض غزلوں میں ملتا ہے وہ چمک اور جھمک (FLASHES) نہیں، جو غالب، سودا، اقبال یا انشا تک میں موجود ہے، مگر اُن کے ہاں حیرت انگیز توازن، حیرت انگیز گدائی، اور حیرت انگیز اثر موجود ہے، وہ جدید شاعری کے پیغمبر اور اردو کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ اُن کے زمانے میں ہمارے ادب میں بہت سے باغ لگائے گئے، اور بہت سی راہیں کھلیں، مگر سب سے زیادہ پھول پھل اُن کے باغ میں اور سب سے زیادہ کشادگی ان کے راستے میں آئی جب انہوں نے دوکان لگائی، تو اگرچہ اُن کا مال نایاب تھا، مگر اکثر گاہک بے خبر تھے، لیکن رفتہ رفتہ سب کو خبر ہوتی رہی، اور آج جس مال پر حالی کی مُہر نہیں، اسے ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے، حالی سے پہلے ہمارے شاعر اور ادیب اپنی جنت الگ بنا لیتے۔ اس میں محو رہتے تھے، حالی نے جنتِ عدن میں رہ کر نجد کی آندھیوں کی لپٹ محسوس کرنا سکھایا، وہ نجد کی گرم ہواؤں میں جنت کی لطافت نہ پیدا کر سکے، اور یہ اقبال کا کام تھا، جو اُن کے صحیح معنوں میں جانشین ہیں۔

دیہاتی مدرسین کی مشکلات اور اُن کا حل

(منشی ہیت رام راوت گوڑ گانوی جے۔ وی فسٹ ایر کلاس گورنمنٹ نارمل سکول کرنال)

دیہاتی مدرسین کا کام بہت دشوار ہے، اولاً تو دیہات میں مکان مدرسہ کیلئے مشکل سے میسر آتا ہے مکان ہے۔ تو سامان نہیں، سامان ہے تو طالب علم نہیں، اگر طلباء ہیں تو بدشوق تعلیم میں دلچسپی نہ لینے والے، اگر طلباء بھی اچھے مل جائیں، تو والدین کی لاپرواہی، غرض ایک مدرس اور ہزاروں آفتیں،

شعر
اپنے غمخواروں میں بھلا کس کس کو یاد کروں
غم مجنوں کروں یا ماتم فرہاد کروں
درد ہے سینے میں۔ دل میں داغ ہیں۔ زخم جگر
ایک میں ہوں اور میرے دشمن جاں سینکڑوں

مگر یاد رہے کہ ایک سمجھدار مدرس ان تمام مشکلات کو آسانی سے دُور کر سکتا ہے اور بچوں کو حفاظت سے بٹھانے کیلئے گاؤں کے معززین سے مل کر بہتر انتظام کر سکتا ہے۔ ان مشکلات کے علاوہ چند ایسی مشکلات ہیں۔ جن کے حل کیلئے مدرس کو بہت زیادہ ثابت قدمی، حکمتِ عملی اور تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ **افسران**:۔ دیہاتی مدرس کے بہت سے حکام ہوتے ہیں، افسرانِ معائنہ، تحصیلدار، ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ، مدرس کا خوشگوار فرض یہ ہے، کہ وہ اپنے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر سرانجام دے۔ اور افسران محکمہ کے احکام کی بخوشی تعمیل کرے، نیز دوسرے محکمہ کے افسران سے تعاون کرنا۔ اپنا فرض اولیں سمجھے اور وقتاً فوقتاً اُن سے مُفید مشورے حاصل کرتا رہے

۲۔ **فراہمی طلباء**:۔ یہ سب سے بڑی مشکل ہے۔ جو مدرس کو دیہاتی مدارس میں پیش آتی ہے

یعنی مدرس کو والدین کی نفرت۔ بدشوقی، گستاخی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لئے مدرس کو گاؤں کے معززین سے تعاون اور رابطہ اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ حاضری:۔ داخل شدہ لڑکے سکول میں حاضر نہیں ہوتے، مدرس بیچارہ در بدر منگتے بھکاری کیطرح پھرتا رہتا ہے۔ اور والدین کی گالی گلوچ، بُرا بھلا برداشت کرتا ہے، اس دقت کو رفع کرنے کیلئے مدرس کا فرض ہے، کہ اپنے سکول میں محلہ وار نیبل سسٹم بناکر گروپ بندی کرے، ہر گروپ کا ایک لیڈر ہو۔ جو کہ اپنے تمام گروپ کی حاضری کا ذمہ دار ہو۔ حاضری کے معاملہ میں مقابلہ کا جذبہ پیدا کیا جائے یعنی ایک جھنڈا انعام کے طور پر دینے کے لئے بنایا جائے، اور وہ جھنڈا اُس گروپ کو دیا جائے جسکی حاضری اچھی ہو۔ اس طریق سے طلباء کی حاضری بہتر ہوسکتی ہے۔

۴۔ مخلوط تعلیم:۔ گورنمنٹ کا دراصل منشا یہ ہے، کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جگہ تعلیم دی جائے کیونکہ اب تک ہندوستانیوں نے لڑکیوں کی تعلیم کیطرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ نئے سکول کھولنے میں بہت لاگت آتی ہے، اس لئے مخلوط تعلیم کی بدولت یہ منشاء پوری ہوسکتی ہے، ابتداءً مخلوط تعلیم کو رائج کرنے میں مدرس پر بہت زیادہ انگشت نمائی ہوگی، تعلیم سے بے بہرہ لوگ اپنے رواج کے موافق اول تو لڑکیوں کو پڑھانا ہی گوارہ نہ کریں گے، اگر وہ مدرسہ میں بھیج بھی دیں، تو لڑکوں کے ساتھ پڑھانا پسند نہ کریں گے، مدرس کو چاہیئے، کہ سب سے پہلے اپنی یا اپنے رشتہ داروں یا دوستوں کی لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ مدرسہ میں داخل کرے، اپنے اخلاق کو قابلِ تقلید بنائے، اور لوگوں کو روزانہ کھیلوں کی مثالیں دیکر سمجھائے۔ کہ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ کھیلتی ہیں،

۵۔ اچھوتوں کی تعلیم:۔ محکمے کا دلی منشا ہے، کہ اچھوتوں کو بھی تعلیم دی جائے، اسی لئے ان کی فیس معاف کی جاتی ہے، مدرس کو چاہیئے کہ وہ متعصب نہ ہو۔ اور اچھوتوں سے کوئی نفرت نہ کرے اور لوگوں کو ریلوں موٹروں وغیرہ (جن میں سب لوگ بلاتمیز فرقہ سفر کرتے ہیں) کی مثال دیکر اُن کے

دل سے جہاں تک ہو۔ تنگدلی اور تعصب کو دُور کرے، تمام مذاہب کے طلبار کو ایک ساتھ تعلیم دے، اس طریق سے اچھوتوں کی تعلیم نمایاں طور پر انجام پذیر ہو سکے گی،

۶۔ **مذہبی معاملات:۔** حکومت بنی جا رہی ہے، اور حکومت کیا ہندوستان کو بھی اس بات کی سخت ضرورت ہے۔ کہ ہندوستان کے باشندے صرف ہندوستانی ہوں، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، کے الفاظ صرف مذہبی معاملات تک محدود ہوں۔ دوسرے ملک کے آدمی بھی مادر ہند کے سپوت کو ہندوستانی کہکر پکاریں، اور یہ جذبہ مدرس ہی پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ بچے سکول میں کورے برتن اور نرم لکڑی کے مانند ہوتے ہیں، جو بات انہیں اس عمر میں بتائی جاتی ہے، وہ اچھی طرح نقش ہو جاتی ہے، بلکہ وہ حقیقت میں مدرس کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ اس کی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں، اگر کوئی مدرس ان باتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ تو وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے مدرس کا فرض ہے، کہ وہ ہر مذہب اور دوسرے فرقہ کے طلباء کے ساتھ یکساں سلوک کرے، مختصر یہ کہ مدرس مدرسہ میں نہ سکھ ہو، نہ مسلم نہ ہندو، اور نہ عیسائی، بلکہ استاد ہو، اور تمام طلباء کو ان کی مذہبی حیثیت سے نہ دیکھے۔ بلکہ ان کو صرف اپنا شاگرد تصور کرے۔

قابلِ غور اقوال

از منشی امر ناتھ جے۔ وی سیکنڈ ایر گورنمنٹ نارمل سکول گزال

۱۔ انسان کا دشمن کون ہے	؟	اس کا بُرا خیال۔
۲۔ امیر کون ہے	؟	جو قانع ہے
۳۔ موت کیا ہے	؟	بدنامی
۴۔ سب سے اچھا زیور کونسا ہے	؟	عمدہ چال چلن
۵۔ دنیا کا فاتح کون ہے	؟	نفس کا فاتح

ملہار

جناب بابو ابناشن چندر صاحب ایڈووکیٹ، کرنال

بھادوں کا مہینہ اختتام پر تھا، مگر آسمان پر گرد و غبار چڑھا ہوا تھا، سخت لو چل رہی تھی، دھرتی ماتا پیاسی تھی۔ جوہڑ سوکھے پڑے تھے، پرند پرند گرمی کے مارے بے حال تھے، کسان پریشان تھے، بار بار اوپر نگاہ اٹھاتے تھے، مگر برکھا کی کوئی امید نہ تھی، سب طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی، قحط کے آثار صاف طور سے نمایاں ہو رہے تھے،

آگرہ کے دیوان خاص میں شہنشاہ اکبر رونق افروز تھے، ابوالفضل، فیضی، ملا دو پیازہ، راجہ بیربل، مان سنگھ، خان خاناں، ٹوڈرمل، تان سین وغیرہ نورتن اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے، تمام دربار جگمگا رہا تھا، مسند کے سہارے بیٹھے ہوئے شہنشاہ نے حقہ نوشی کرتے ہوئے فرمایا، ابوالفضل رعایا کس حال میں ہے؟

ابوالفضل۔ جہاں پناہ! بارش کی کمی نے رعایا کو پریشان کر رکھا ہے، اور ہر شخص اس وقت اندر دیوتا سے دعا مانگ رہا ہے،

اکبر نے سرد آہ بھر کر فرمایا۔ اس کا کوئی انتظام بھی کیا گیا ہے۔

مان سنگھ۔ مہابلی! جہاں تک ممکن تھا، کنوؤں سے آبپاشی کا انتظام کیا گیا ہے،

اکبر۔ کیا اس سے رعایا کا دکھ دور ہو جائیگا؟

مان سنگھ۔ عالیجاہا! کسی قدر، مگر بغیر بارش کے کھیتی کا پورا نہیں پٹ سکتا،

بادشاہ نے آسمان کیطرف منہ کر کے کہا اللہ! تیری مخلوق صرف تیرے سہارے ہے!

بیربل۔ مہابلی! لوگوں نے ہزاروں جگیں کیں، بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ سب مندروں میں باقاعدہ آرتی اور مسجدوں میں نمازیں ہو رہی ہیں۔ مگر پرجا کا کشٹ نوارن نہیں ہوتا، مُلّا دوپیازہ۔ خداوند عالم! بیربل نے آج تک بھی سچے دل سے دُعا نہیں مانگی۔

بیربل۔ مہابلی! مُلّا کو تو ہر روز جگ اور لنگر سے کھانا مل جاتا ہے، اسی لئے جہاں اور لوگ سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں۔ یہ حضرت دُنبہ کیطرح روز بروز پھول رہے ہیں،

فیضی۔ افسوس! تمام کوششیں بیکار گئیں، عوام الناس تکلیف میں ہیں، مگر عقل کچھ کام نہیں کرتی،

خان خانان بول اُٹھے۔ کہ کسی مہایوگی سے جگ کرانا چاہیئے۔

اکبر۔ یہ درست ہے۔ ہندوستان جنت نشان کے یوگی تمام عالم میں مشہور ہیں۔ مگر اُن کا ملنا بھی تو محال ہے۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا کامل یوگی ہے؟

ابوالفضل۔ خداوند نعمت! آس پاس تو ایسا کوئی باکمال یوگی نہیں ہے، اگر تلاش کیجائے تو شاید ہمالیہ اور بندھیاچل کی دشوار گذار پہاڑیوں میں مل جائیں، مگر تلاش کو بھی تو ایک عمر چاہیئے۔ بادشاہ نے فرمایا۔

بیربل۔ بلاشبہ مہابلی! اتنے میں پرجا کا دکھ کئی گنا اور بڑھ جائیگا۔

شہنشاہ نے گہرا سانس لیا۔ دل مغموم ہوگیا۔ اہلِ دربار کے چہروں پر افسردگی نظر آنے لگی۔ سب خاموش تھے، معاً بیربل قہقہہ مار کر ہنس پڑے، حاضرین کو اس کی گستاخی پر غصہ آیا مگر وہ منہ چڑھا مصاحب تھا۔ اکبر نے ذرا ترش رو ہوکر فرمایا:—

بیربل! وجہ گستاخی بیان کرو؟

بیربل۔ مہابلی! ہم سب کی آج وہی مثال ہوئی۔ کہ بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔

تان سین تو آپ کے پاس موجود ہے ہی۔ حکم دیجئے۔ کہ یہ کوئی ایسا ترانہ چھیڑے کہ بارش چھما چھم چھما چھم برس پڑے،

مہاراج نے اُس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے فرمایا، کہ یہ ممکن ہے کہ موسیقی کے اثر سے بارش شروع ہو جائے؟

ابوالفضل۔ بول اُٹھے۔ دین پناہ! میں نے کتابوں میں تو ایسا ہی پڑھا ہے۔ کہ بارش تو کیا! موسیقی نے بجھے ہوئے چراغ کو جلا سکتی ہے، گرمی کو برسات میں تبدیل کر سکتی ہے۔

یہ کیا کہا آپ نے! ابوالفضل۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔

بیربل بول اٹھے۔ حضور! ابوالفضل سچ فرما رہے ہیں۔

اس کا مطلب؟ اکبر نے پوچھا۔

بیربل۔ دنیا بندھو! اس کا مطلب صاف ہے، گانے کے اثر سے پانی برس سکتا ہے، اور بجھے ہوئے چراغ روشن ہو سکتے ہیں،

شاہ عالم! فیضی نے زور دیتے ہوئے کہا، آپ خود تان سین سے اس مسئلہ پر دریافت فرمائیں

اکبر۔ رائے مبارک ہے۔ تان سین! کیا فیضی، ابوالفضل اور بیربل درست فرما رہے ہیں؟

جی جہاں پناہ۔ تان سین نے عرض کی، یہ سب درست فرماتے ہیں،

اکبر۔ کیا گانے میں اتنا اثر ممکن ہے، کہ بارش ہونے لگے؟

تان سین۔ بیشک جہاں پناہ۔ ملہار راگ کے گانے سے بارش ہونا ضروری ہے، بشرطیکہ گانے والا ماہر فن ہو،

اکبر۔ کیا تم وہ ملہار جانتے ہو؟

تان سین۔ جی سرکار! جانتا تو ہوں، مگر۔۔۔۔۔۔۔۔

اکبر۔ مگر کیا ؟

تان سین۔ شاید میں اُس کو مکمل طور سے ادا نہ کرسکوں

اکبر۔ کیوں ؟

تان سین۔ اس لئے کہ یہ نہایت مشکل راگ ہے، ہر تال وسُر کا پورا آترنا شرط ہے،

اکبر۔ تم جانتے تو ہو نہ ؟

تان سین۔ جی حضور،

اکبر۔ تو ہم حکم دیتے ہیں۔ کہ ملہار چھیڑا جائے، مجھے اتبک یقین نہیں، کہ بارش ہوا

تان سین مجبور ہو گیا، شاہی حکم کوٹالنے کی کہاں مجال تھی۔ سازندوں نے ساز ہم آہنگ کئے، اُس نے تنبورا سنبھالا اور سُر ملاکر ملہار کی آلاپ شروع کی، نغمہ گونجنے لگا، شاہی عمارات کی فضا ترنم سے بھر گئی، حاضرین مست ہوگئے، ٹھنڈی ہوا چلنی شروع ہوئی، آسمان پر کچھ کچھ سیاہی پھیلنی شروع ہوئی، شہنشاہ بھی مست ہوگئے، وہ دو گھنٹہ تک گاتا رہا، اُس نے اپنا سارا کمال ختم کردیا مگر بارش نہ ہوئی، وہ غمگین ہوگیا، دل بیٹھ گیا، غرور خاک میں مل گیا، آخر راگ ختم ہوا۔

حاضرین نے مبارکباد دی، شاہ نے خوشی کا اظہار کیا، مگر خندہ زن ہوکر بولے۔ ابوالفضل میں نہ کہتا تھا، کہ بارش نہ ہوگی، اور نہ کوئی شخص اس کا دعویٰ کرسکتا ہے، فرمائے اب تو آپ کا خیال غلط ثابت ہوا ؟

"تان سین پسینے سے شرابور تھا۔ اُس کا تمام غرور مٹ چکا تھا۔ اب وہ انکساری اور شرم کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا"

جہاں پناہ ممکن ہے۔ تان سین مکمل طور سے راگ نہ گا سکتے ہوں۔ ابوالفضل بولے۔ مگر جو کچھ خادم نے پہلے عرض کی ہے وہ بالکل درست ہے۔

بیربل۔ مہابلی! ابوالفضل ٹھیک کہتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے، ٹھنڈی ہوا چل پڑی، آسمان پر سیاہی نمودار ہو گئی۔ یہ سب ملہار کی بدولت ہے، ممکن ہے۔ ادائیگی میں کچھ کسر رہ گئی ہو۔

اکبر نے تان سین کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "تان سین! تم اپنے کو سنگیت میں ودّیا کامل سمجھتے ہو۔ اور اسی وجہ سے دربار کے نورتن میں ہو۔ مجھے یقین نہ تھا کہ تم میں ابھی خامی ہے۔ تمہاری بدولت ہزاروں لوگ پھانسی پر چڑھ چکے ہیں، اگر ہو سکے تو جواب دو"

تان سین کے ساتھ آج تک ایسی گفتگو نہ ہوئی تھی، اس کو جان کے لالے پڑ گئے، بدن میں رعشہ آگیا، اکبر گو اس کے کمال سے بخوبی آشنا تھے، مگر اس وقت اُن پر ملہار کا خبط سوار تھا۔ بولے۔ صرف ایک شرط پر اب دربار میں رہ سکتے ہو، اور وہ یہ ہے۔ کہ ملو وہ ملہار سنواؤ۔ جو مکمل ہو۔

سنگیت ودّیا پریشان ہو گیا، اُس نے سمجھ لیا کہ سنت قریب ہے۔ بغیر عزت کے زندگی موت سے بدتر ہے۔ سوچا۔ اُمید کی کرن نظر آئی، سجدہ بجالا کر عرض کی۔

دنیا بندھو! تشریف لے چلیں۔ آپ کو ملہار سنوائی جاویگی۔

اکبر۔ کہاں؟

تان سین۔ جنگل میں

اکبر۔ کون سنائیگا۔

تان سین۔ گورو ہری داس۔

اکبر نے دربار برخاست ہونے کا حکم دیا۔ اور مصاحبوں کیساتھ گورو ہری داس کی کٹیا کیطرف چلے، وہاں پہونچکر سوامی جی کو نمسکار کی، انہوں نے سب کو آسیس دی۔ آخیر میں تان سین کی باری آئی، اُس کو دیکھتے ہی فرمایا، کیوں؟ ملہار ٹھیک نہیں سنائی۔ اور اسی لئے مہاراج کو کشٹ اُٹھانا پڑا۔

اکبر بول اُٹھے۔ سوامی جی اگر کرپا ہو۔ تو ملہار سنا دیجئے۔ کیونکہ اسی اچھیا سے ہم لوگ آپ کے

چرنوں میں حاضر ہوئے ہیں، گوروجی نے ہنستے ہوئے اپنا "ایک تارا" سنبھالا اور آلاپ نے لگے، نغمہ نے عجیب کیفیت پیدا کی۔ گوروجی خود بھی مست ہو گئے، دیکھتے دیکھتے آسمان پر کالے بادلوں کی گھٹا اُمنڈ آئی، جب راگ پورے زوروں پر پہنچا۔ تو بادلوں سے ہلکی ہلکی پھواریں شروع ہوئیں۔ پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی، جل تھل ایکطرف ہو گئے، کسانوں کے دل خوشی سے معمور ہو گئے، کامل نین گھنٹہ راگ ہوتا رہا۔ جب ختم ہوا۔ تو سب محو حیرت تھے، پتھر کے بت کیطرح ساکن تھے، سوامی جی نے سب کو ہوشیار کیا۔ کچھ دیر بعد حواس ٹھکانے ہوئے، گوروجی نے فرمایا۔ اکبر۔ ملہار سنا؟

جی مہاراج۔ اکبر نے جواب دیا۔ مگر..........

گوروجی۔ مگر کیا؟

اکبر اب ایک بات دریافت طلب ہے اگر اجازت ہو؟

پوچھو۔ سوامی جی نے کہا۔

اکبر نے دربار کی تمام کہانی بیان کی، اور بولے "مہاراج تان سین نے بھی بالکل اسی طرح جس طرح سے آپ نے سنایا ہے۔ گایا تھا، مگر اُس کے گانے سے بارش نہیں ہوئی، اِس کا کارن"؟

گوروجی ہنس پڑے۔ اور فرمایا:۔

"تان سین گاوے اپنے راجہ کے آگے
ہری داس گاوے اپنے راجہ کے آگے

یہ سُن کر سب کی آنکھیں کھل گئیں، اور وہ گوروجی کے قدموں میں گر پڑے، انہوں نے سب کو آشیرباد دیکر رخصت کیا۔

بقائے آرزو

از منشی اللہ دیا صاحب متعلم جے۔ وی کلاس II ایز نارمل سکول کرنال۔

آرزو انسانی زندگی کی ایک بہترین خصلت ہے، آرزو ہی سے ہر ایک چیز کا عشق وابستہ ہے، جب تک آرزو سینے کے اندر زندہ ہے۔ تب تک عشق بھی قائم ہے لیکن جونہی آرزو فنا ہوئی، انسانیت کے تمام فضائل رخصت ہوگئے، لہذا احساس خودداری اور عزت نفس کے لئے اس کا قرار بھی لازمی ہے،

جس قدر زندگی اور عمل کیلئے آرزو مفید ہے اُس سے کہیں زیادہ مایوسی مضر ہے۔ ناامیدی اور اوہام کے غلبہ سے قوت تخلیق بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ پس آرزو کے ساتھ زندگی اور زندگی کے ساتھ آرزو کا ہونا لازمی ہے، جس شخص میں جستجو کا جذبہ نہیں وہ ایک چوپائے سے بدتر ہے، دنیا آرزو ہی کے فیض سے معمور نظر آتی ہے، اور یہ ایک ایسا ساز ہے، جس کے حیات افروز نغموں نے فضائے عالم کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ذرہ ذرہ اسی کے فیض سے متحرک نظر آتا ہے۔ آرزو اور جستجو کا جذبہ ہر ایک چیز کی فطرت میں ہے اور وہ اسکی بجاآوری کیلئے قدرتی طور پر مجبور ہے،

اگر انسان آرزو مند ہی رہنے کا عادی بنا رہے، اور آرزو کو مستعدی سے عمل میں نہ لائے تو یہ آرزو خطرناک بیماری ثابت ہوگی، وہ خود آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر بیٹھ جائیگی، اور اپنے زہریلے تاثرات انسانی جسم میں چھوڑ جائے گی، جس کا نتیجہ ایک حسرتناک موت ہوگی۔

انسان کے لئے لازمی ہے، کہ وہ اپنے لئے ایک خاص نصب العین قرار دے لے، اس کے لئے موقع ہے، کہ وہ اپنے دل میں کسی بلند ترین مقصد کیلئے تخم ریزی کرے، کیونکہ اس کا دل مقاصد کی تعمیل کیلئے کافی زرخیز ہے۔ لیکن جب دل شوریدا اور بیکار ہوگیا۔ تو اس سے کسی قسم کا خوشنما پودا یا بارآور درخت پیدا نہیں ہوسکے گا۔

ناظرین کرام! آرزو بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک ہجر اس کی حیات و بقا کا سامان پیدا نہ کرے زندگی کی حقیقی راحت ہجر سے ہے، ہجر ہی نے آرزو اور شوق کا سوز تمام کائنات کی ہر ایک چیز کو بخشا ہے، زندگی کا قائم رہنا آرزو کی ناتمامی پر موقوف ہے، اور شوق کا کمال یہی ہے، کہ وہ اپنے مقصد اور مدعا سے محروم رہے، آرزو اور شوق کیلئے وصال زہرِ ہلاہل کا اثر رکھتا ہے، اس جگہ پہنچ کر زندگی کی تمام لذتیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ دنیا ایک افسردگی اور موت کی دنیا معلوم ہونے لگتی ہے۔

پس ایک دائمی زندگی کا راز ہجر اور صرف ہجر ہی کے اندر پوشیدہ ہے، وصال سے آرزو اور شوق بالکل مٹ جاتا ہے، جس طرح موج محیط پانی میں سوزِ فراق سے مضطرب رہتی ہے، اگر وہی موج ساحل سے آن ملے، اور وصل حاصل کرے، تو وہ آنِ واحد میں معدوم ہو جاتی ہے۔

ہماری اصل خوشی اور زندگی کا حقیقی سوز و ساز ایک غیر متناہی آرزو میں پوشیدہ ہے، ہمارا جذبہ تخلیق اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ جبکہ ہم اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہیں،

سیاحوں کو دیکھو۔ کہ وہ میدانوں، پہاڑوں کو عبور کرتے چلے گئے ہیں، لیکن "کاش" کا لفظ بدستور اُن کی زبان پر جاری رہا۔ اسی طرح کوئی قابل ترین مصور بہتر سے بہتر شاہکار پیش کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوا۔ ساہوکاروں، سرمایہ داروں کو دیکھو۔ کہ لاکھوں کروڑوں روپیہ جمع کر لیتے ہیں لیکن مرتے وقت ایک نہ ایک صندوق ان کا خالی رہتا ہے،

ہجر اور فراق کے بعد عمل نہایت ضروری شے ہے، یہ جستجو کی بلند پروازی ہے جو انسان کو سرگرم عمل رکھتی ہے۔

یا یوں کہیئے۔ کہ فراق کی موجودگی خواہ کسی شکل میں ہو۔ کسی دنیوی مقصد سے یا عشقِ الٰہی کا رنگ رکھتی ہو۔ یا جفاکار اور بے رحم معشوقہ کی وجہ سے ہو۔ جسم میں بیداری اور احساس میں ایک بے پناہ رعشہ پیدا کئے رکھتی ہے،

عمل ہی سے ہر ایک چیز زندہ رہتی ہے، اور عمل کے نہ کرنے سے معدوم ہو جاتی ہے، اس لئے ہم کو اپنے دلوں اور ارادوں کو بلند رکھنا چاہیئے، اور اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بڑھتے چلا جانا چاہیئے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مشہور تاریخی واقعات

ذیل میں دنیا کے مشہور تاریخی واقعات مع سنہ دیئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

۱۔ ہندوستان میں سب سے پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین۔ سنہ ۱۲۰۶ء

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ ..... سنہ ۷۱۱ء

۳۔ ترکی کا قسطنطنیہ پر قبضہ۔ سنہ ۱۴۵۶ء

۴۔ امریکہ کی دریافت سنہ ۱۴۹۲ء

۵۔ انگریزوں کا ہندوستان میں داخلہ سنہ ۱۶۱۳ء

۶۔ پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس سنہ ۱۶۴۰ء

۷۔ کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی سنہ ۱۶۶۰ء

۸۔ دہلی میں قتل عام کا حکم سنہ ۱۷۳۹ء

۹۔ جنگ انگلشیہ و فرانس سنہ ۱۷۴۸ء

۱۰۔ ولایت میں ریل جاری ہوئی۔ سنہ ۱۸۲۰ء

۱۱۔ ستی ہونے کی ممانعت سنہ ۱۸۳۳ء

۱۲۔ انگریز کابل میں داخل ہوئے سنہ ۱۸۳۴ء

غزل

از منشی توفیق احمد عباسی تفتہ متعلم نارمل سکول کرنال

سینے کے داغ ہیں گل، سینہ ہے گلشن میرا ہو گئے زخم ہرے، آگیا ساون میرا
آہ! طے کرنا پڑا فاصلۂ عمرِ دراز کاش! رہتا ترے کوچے ہی میں مسکن میرا
حرص یک دانہ کا حاصل ہے یہ دامِ دنیا ورنہ تھا متصلِ عرش نشیمن میرا
غیر سے ہو جو تعلق، وہ ہے برقِ سوزاں تجھ سے جو عشق و محبت ہو، وہ خرمن میرا
میرا مالک، مرا مولا، مرا محبوب ہے تو تو ہی ملجا، تو ہی ماویٰ تو ہی مامن میرا
سکھ بھی، عیسائی بھی، ہندو بھی مسلماں بھی ترا پھر عدو کس کا ہوں میں، کون ہے دشمن میرا

سوزِ ہجراں سے میں خود تفتہ ہوں لیکن اس پہ
"بجلیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں نشیمن میرا"

طریقۂ تدریس

سوالات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ و ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جوابات

از خامہ حافظ محمد رضوان اللہ صاحب ٹیچر گورنمنٹ نارمل سکول کرنال۔

کامیاب مدرس بننے کے لئے سوالات کی موزونیت ازبس ضروری ہے کیونکہ اکثر مضامین مثلاً علم ہندسہ، ریاضی صرف و نحو، اور ترجمہ سبق کا وہ ٹکڑا جس میں استدلال ہو۔ ایسے ہیں کہ جن کی تدریس سوالات کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے۔ کہ انگریزی میں کہتے ہیں (ترجمہ) "جو شخص اچھے سوالات کرسکتا ہے، وہ اچھا مدرس ہے"۔ اگرچہ یہ بیان خالی از مبالغہ نہیں، لیکن دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے سوالات کی عمدگی کی اشد ضرورت ہے، وکیل جو جرح کرنے میں مشاق نہ ہو۔ وہ دیوانی مقدمات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

سوالات اگر موزوں اور درست ہوں گے تو طلباء کی رہنمائی ہوگی، اور انہیں مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہوگی، لیکن اگر سوالات ناقص ہونگے، تو طالب علم گمراہ ہو جائے گا۔ متذکرہ بالا امور سے سوالات کی اہمیت ذہن نشین ہوگئی ہوگی، لیکن یہ کہنا درست نہیں، کہ بہترین مدرس وہ ہے۔ کہ جو بہترین سوالات کرسکے۔ کیونکہ اکثر مضامین ایسے ہیں۔ کہ جن میں سوالات کرنا فضول ہے، مثلاً تاریخ یا جغرافیہ میں کسی نئے بادشاہ کے حالات یا نئی جگہ تبلانے کے لئے قوت بیانیہ کی ضرورت ہوگی، سوالات کرنے فضول ہوں گے، یہاں مدرس کو طرز بیان سے کام لینا چاہیئے۔ جیسے شاعر پیدائشی ہوتا ہے، ویسے ہی معلم بھی پیدائشی ہوتا ہے، بنائے نہیں بنتا، اور قدرتی مدرس کے اوصاف بھی وہبی ہوتے ہیں، کسبی نہیں ہوتے، اور طرز بیان بھی خدا داد۔

ہمیں بے شمار مدرسین کی ضرورت ہے، اور وہ سب پیدائشی مدرس نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ مجبوراً اس پیشہ کو اختیار کرتے ہیں، ضرورت ہمیں اس بات پر مجبور کر رہی ہے، کہ معمولی اساتذہ میں بھی وہ اوصاف پیدا کرنیکی کوشش کی جائے، جو کہ ایک پیدائشی مدرس میں ہوا کرتے ہیں، بہر حال جہاں معلم کو طرز بیان

سے کام لینا پڑے، وہاں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ،

۱۔ تمام واقعات کو ترتیب دے لینا ضروری ہے، ورنہ بے لطفی پیدا ہو جائیگی، موخر مقدم اور مقدم موخر ہو جائیگا

۲۔ جو باتیں اہم ہوں اُن پر زیادہ زور دینا چاہیئے ۔ نیز اگر ممکن ہو۔ تو اُن کا خاکہ تختہ سیاہ پر لکھ دیا جائے ،

۳۔ طرز بیان ایسا ہو۔ کہ طلباء اُسے بآسانی سمجھ سکیں ، زبان سلیس اور قابل فہم ہو۔ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال موزوں نہیں ،

۴۔ اپنے بیان کو موثر بنانے کیلئے ضروری ہے ۔کہ مدرس کی آواز اور لب ولہجہ موزوں ہو۔ اگر آواز کرخت ہوگی تو طلباء کی طبیعت گھبرائیگی ، اور اگر پست ہوگی تو جماعت میں بدنظمی پھیل جائیگی ، بہرحال آواز ایسی ہو ، کہ طلباء کو بُری نہ معلوم ہو۔ اور تمام طلباء اُس سے بآسانی مستفید ہو سکیں ۔

اچھے معلم سے یہ توقع ہوتی ہے ،کہ وہ عمدہ سوالات کر سکتا ہے ، سوالات تین قسم کے ہوتے ہیں ، اوّل وہ جو سبق کے آغاز میں کئے جاتے ہیں ، انہیں ابتدائی سوالات کہتے ہیں ،

دوسرے وہ سوالات جو دوران سبق میں کئے جاتے ہیں، انکو تدریسی سوالات کہتے ہیں ،

تیسرے وہ سوالات جو سبق کے اختتام پر کئے جاتے ہیں ، اُن کو اعادہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ ابتدائی سوالات کا یہ مقصد ہوتا ہے ، کہ ان کے ذریعہ طلباء کی سابقہ معلومات کو مستحضر کیا جائے ۔ اور انہیں اس طریق سے مرتب کیا جائے ۔ کہ آئندہ سبق کے ساتھ مربوط ہو سکیں ، ان سوالات کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہیئے ، کہ وہ تعداد میں زائد نہ ہوں ، ماہرین تعلیم کا خیال ہے ۔کہ ایسے سوالات دو چار سے زائد نہ ہوں ، صرف اُن باتوں کے متعلق سوالات کئے جائیں جو آئندہ سبق سے متعلق ہوں ، نیز ان سوالات کی حیثیت عمومی ہونی چاہیئے ، اعادہ کے سوالات اور ابتدائی سوالات کی حیثیت تقریباً یکساں ہے موخر الذکر گذشتہ معلومات کو مستحضر کرنے کے لئے ہیں ، اور اوّل الذکر اِس پڑھے ہوئے سبق کو طلباء کے ذہن نشین کرانے کیلئے ، ان کے متعلق اِس چیز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ، کہ ان سوالات کی بدولت اصل مضمون طلباء کے ذہن نشین ہو جائے ، ایسا نہ ہو کہ طلباء ضمنی مقاصد میں اُلجھے رہیں ۔

تدریسی سوالات :- یہ سوالات بہت اہم ہیں ان ہی سوالات کی بدولت مدرسین سبق کو طلباء کے ذہن

نشین کرتے ہیں۔ سوالات کے متعلق ایک بہت اہم اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور وہ تقریباً صحیح ہے "کہ سوالات کے ذریعہ معلمین مضامین کو پڑھاتے ہیں، جن میں بیشتر سوالات ایسے ہوتے ہیں، کہ اُن کے جواب میں صرف ایک آدھ لفظ کہنا کافی ہوتا ہے، اِس لئے طلبار کی قوت بیانیہ رک جاتی ہے۔ اور جب کبھی طلبار کو کسی مضمون کے بیان کرنے کیلئے کہا جاتا ہے تو وہ بہت بُرا اور بھدّہ نمونہ پیش کرتے ہیں"

اس نقص کو رفع کرنیکی تدبیر یہ ہے، کہ جب معلّم کسی مضمون کے کسی حصّہ کو سوالات کے ذریعہ طلبار کے ذہن نشین کرائے تو آخر میں ایک دو سوالات اس قسم کے بھی ضرور ان طور پر کرے جنہیں طلبار کو مسلسل بولنے کے سوا چارہ کار نہ ہو۔ تدریسی سوالات کے متعلق یہ یاد رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ کہ وہ مختصر ہوں نیز ان کی عبارت سلیس ہو۔ تاکہ مضمون طلبار کے بآسانی ذہن نشین ہو سکے،

۲۔ سوالات اس قدر آسان ہوں، کہ طلبار کو غور و فکر کرنیکی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ اور وہ فوراً بلا تامل جوابات دیا کریں۔ (مثلاً مدرس جلدی سے سبق پڑھانا چاہتا ہے، اور وہ پوچھتا ہے کہ کیا کھا کر آئے ہو)

۳۔ سوالات متعین ہوں، تاکہ طلبار کا دماغ متوقع جواب کیطرف منتقل ہو سکے، بخلاف غیر محدود سوالات طلبار کیلئے پریشانی کا باعث ہوتے ہیں، (مثلاً یہ لفظ کیا ہے؟ وہ آدمی کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ)

۴۔ سوالات مبہم نہ ہونے چاہییں۔

۵۔ سوالات معکوس نہ کئے جائیں۔ (مثلاً مدرس بتلاتا ہے، کہ شیر بلی جیسا ہوتا ہے، پھر پوچھتا ہے، کہ شیر کیسا ہوتا ہے؟ بلی جیسا۔ شاباش)

۶۔ سوالات انفرادی نہیں ہونے چاہئیں، کیونکہ اس سے جماعت سست پڑ جاتی ہے۔

جوابات:۔

سوالات کے جوابات بعض تو بالکل صحیح ہونگے بعض بالکل غلط، لیکن زیادہ تر جوابات ایسے ہونگے، کہ جنکو نہ بالکل غلط اور نہ بالکل درست کہا جا سکتا ہے، اگر جوابات بالکل غلط ہیں، یا اصلاح طلب ہیں تو مدرس کو صرف رد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس طریقے سے طلبار اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہو سکیں گے، نیز اُن کی ہمت پست ہو جائیگی، جوابات کی

غلطی کے اکثر تین اسباب ہوتے ہیں :-

۱- طالب علم کی بے توجہی۔ (۲) یہ کہ طالب علم سوال کو بالکل سمجھ نہ سکا ہو۔ (۳) طالب علم ضمنی مضمون کو اصل مضمون سمجھ رہا ہو۔ اور اسی کو اصل مقصد سمجھتا ہے،

اسکی اصلاح کیلئے استاد کو بہترین طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ مفید اور بہتر طریقہ وہ کہ جسکو سقراط اختیار کیا کرتا تھا۔ مدرس سقراطی سوالات کر کے طالب علم کو اسکی غلطی پر متنبہ کر دے، اسکی صورت یہ ہوگی۔ کہ طالب علم کے سوال کو رد نہ کیا جائے بلکہ صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اور پھر چند ایسے سوالات کئے جائیں کہ جن کے دوران میں طالب علم اپنی غلطی کو خود بخود محسوس کرے،

معلم کو چاہیئے کہ سقراطی سوالات تعمیری نقطۂ نگاہ سے کرے۔ سقراط ایک عجیب آدمی تھا۔ وہ عام اور جاہل لوگوں کو اُن کی برائیوں اور غلط فہمیوں کے متعلق اپنے سوالات کے ذریعہ قائل کر دیتا تھا۔ مثلاً ایک شخص نے اس سے کہا۔ کہ تم بہت بھدے ہو۔ سقراط نے کہا کیوں؟ اُس شخص نے کہا کہ تمہارے نتھنے بہت فراخ ہیں۔ سقراط نے دریافت کیا نتھنے کس کام آتے ہیں، سائل نے جواباً کہا تنفس کے لئے سقراط نے پوچھا فراخ نتھنے تنفس کے لئے مفید ہیں یا تمہارے جیسے سائل لاجواب اور اُس کا قائل ہو گیا،

سقراط نے ایک مرتبہ ایک حبشی لڑکے سے دریافت کیا۔ کہ ایک مربعہ کا رقبہ ۴ مربع فٹ ہے، ایک دوسرا مربعہ ہے کہ جس کا رقبہ اِس سے دوگنا ہے۔ تو پہلے مربعہ کا ضلع کیا ہوگا۔

اُس نے کہا دو فٹ۔ تو دوسرے کا کیا ہوگا، کہا چار فٹ۔ سقراط نے کہا۔ تو پھر دوسرے کا رقبہ کیا ہوا اُس نے کہا سولہ۔ سقراط نے کہا۔ کہ پہلے سے کے گُنا ہوا؟ کہا چار گنا۔ اُس نے کہا کہ چار گنا اور دوگنا ایک ہی بات ہے۔ لڑکے نے کہا نہیں سقراط نے پوچھا کہ پھر تمہارا جواب درست ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔ لڑکے نے جواب میں پھر تین فٹ کہا۔ سقراط نے اُسے بھی غلط ثابت کیا۔ "تا آنکہ طالب علم نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔

کر فکرِ عمل، ذکرِ خط و خال عبث ہے
اے فیضؔ ذرا اپنے خیالات بدل ڈال

"ارشاداتِ عالیہ"

حال میں جو تقریر آنریبل میاں عبدالحی وزیرِ تعلیم پنجاب نے لاہور میں فرمائی ہے ہم اُس کا اس اشاعت میں اقتباس ہدیۂ ناظرین کرام کر رہے ہیں۔ تاکہ ہمارے ناظرین کو پنجاب کے نصابِ تعلیم کی افادیت اور واردھا سکیم کے نقائص اجمالی طور پر معلوم ہو سکیں۔ (ادارہ)

آنریبل میاں عبدالحی وزیرِ تعلیم پنجاب نے آج ماڈل ٹاؤن لاہور میں پنچائت فیلڈ سٹاف کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ پنجاب کی نصاب تعلیم کمیٹی واردھا ایجوکیشن سکیم سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ واردھا سکیم کا مدعا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کہ ہندوستان کو ایک "جلاہوں کی قوم" میں تبدیل کر دیا جائے۔ آں محترم نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے وقت کے ہندوستانی مدرسوں کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اُس وقت طلبا، مدرسوں سے روتے ہوئے آتے تھے۔ گویا مدرسہ اُن کیلئے جیل خانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن برعکس اِس کے آج مدرسوں کی یہ حالت ہے کہ اُن میں اگر ایک طرف باقاعدہ ہدایت آفریں نصاب ہے۔ تو دوسری طرف اِس نصابِ تعلیم میں جاذبیت بھی پیدا کر دی گئی ہے۔ تاکہ طلبا خود اپنے لئے راستہ تجویز کرنے کے قابل بن سکیں دیہات میں تعلیم نسواں کے متعلق اظہارِ خیال فرماتے ہوئے آں محترم نے فرمایا۔ کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کے عام کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا۔ کہ اگر مرد اپنے بچوں کی تعلیم سے غافل رہیں گے۔ تو عورتیں اِس تغافل کو ہرگز گوارا نہ کر سکیں گی۔ اور ہر ممکن طریق سے اپنے بچوں کو خواندہ بنانے کی سعی کریں گی۔